ماہنامہ **محدث** بنارس

شمارہ/٦	جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ	جون ۲۰۰۸ء	جلد/ ٢٦

مدیر
عبدالوہاب حجازی

پتہ
دارالتالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱جی، ریوڑی تالاب
وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک
سالانہ ۱۲۰/ روپے
فی پرچہ ۱۲/ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔

اس شمارہ میں

www.aljamiatussalafiah.org
E-mail: jamia@aljamiatussalafiah.org / secretary@aljamiatussalafiah.org

درس قرآن

ہماری زندگی ہمارے لئے عبرت ہے

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿ الٓرٰ، كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، اللّٰهِ الَّذِيْ لَهُ مَا فِيْ السَّمَاوَاتِ وَمَا فِيْ الْأَرْضِ وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجاً، أُوْلٰئِكَ فِيْ ضَلَالٍ بَعِيْدٍ ﴾ (سورہ ابراہیم:۱-۳)

الر، یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر اُجالے کی طرف لائیں ان کے پروردگار کے حکم سے، زبردست اور تعریفوں والے اللہ کے راستے کی طرف، اس اللہ کی طرف کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا ہے، اور ہلاکت ہے سخت عذاب کی ان کافروں کے لئے، جو آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی کو پسند کرتے ہیں اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس (اللہ کی راہ) میں ٹیڑھ پن پیدا کرنا چاہتے ہیں، یہی لوگ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔

یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے، اس وقت مکہ میں جاہلیت کا ماحول تھا، اللہ کے رسول محمد ﷺ نبی بنا کر مبعوث ہوئے، قرآنی آیات پڑھ کر آپ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دے رہے تھے، ان قرآنی آیات کی معجز بیانی سے لوگ متاثر ہو رہے تھے، اللہ تعالی نے اس آیت میں بتایا کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد کیا ہے، اور جو انسان اس قرآنی ہدایت سے انکار کرے گا یعنی کفر کرے گا اس کو عذاب شدید سے آگاہ کیا گیا ہے۔

قرآنی ہدایت سے انکار کون کرتا ہے؟ جس کو اللہ پر ایمان نہیں، آخرت کے مقابلہ دنیا کے عیش وعشرت میں محو ہو کر اسی زندگی کو سب کچھ سمجھتا ہے، اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والوں کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے، ایسے کافروں اور دین سے بھاگنے والوں کے بارے میں قرآن مجید کا بیان ہے کہ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اصل زندگی اور ابدی وسرمدی زندگی آخرت کی زندگی ہے، جس کو قرآنی ہدایات پر عمل کئے بغیر پانا مشکل ہے، دنیا کی بے ثباتی اور یہاں کے عیش وعشرت کی ناپائیداری ہم سب کے سامنے ہے، روز روز ہم کسی نہ کسی کو فوت ہوتا دیکھ رہے ہیں، کتنے عیش وعشرت کرنے والے دیکھتے دیکھتے دولت سے محروم ہو جاتے ہیں، عمل صالح اور نیک کاموں میں تعاون، دین کی خدمت اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ ہمدردی یہ ایسی بیش قیمت دولت ہے جو ہم کو آخرت کی زندگی میں عیش وعشرت اور سکون کی زندگی عطا کرسکتی ہے۔

کاش ہم اس قرآنی ہدایت پر غور کرتے اور اپنے طرز زندگی اور طرز معاش پر سوچتے اور اپنے قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر توشۂ آخرت اکٹھا کر لیتے، جو ہمیں روز جزا ندامت سے بچا سکتا۔

☆☆☆

درس حدیث:۱۱۴

وصیت تہائی مال سے زائد نہیں

تحریر: مولانا عبدالسلام مدنی / استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن سعد بن أبی وقاص ؓ، قال: مرضت عام الفتح أشفيت على الموت، فأتانی رسول الله ﷺ يعودنی، فقلت: يا رسول الله ! إن لي مالا كثيرا، وليس يرثني إلا ابنتي أفأوصى بمالي كله ؟ قال: لا. قلت: فثلثى مالي ؟ قال: لا، قلت: فالشطر ؟ قال: لا . قلت: فالثلث ؟ قال: الثلث، والثلث كثير. إنك أن تذر ورثتك أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس، وإنك لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله إلا أجرت بها، حتى اللقمة ترفعها إلى في امرأتك. متفق عليه. (مشكاة ج۱، ص ۲٦٥)

قال الترمذی: هذا حديث حسن صحيح . وقال المباركفوری: وأخرجه الجماعة. (التحفة ج٦، ص ۳۰۳)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے سال میں سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب ہوگیا، رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے پاس بہت مال ہے، اور (ذوی السہام میں سے) صرف میری ایک بچی ہی وارث بننے والی ہے تو کیا میں اپنا پورا مال (کار خیر کے لئے) وصیت کردوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا تو دو تہائی؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے کہا آدھا مال؟ ارشاد ہوا: نہیں۔ میں نے عرض کیا تو ایک تہائی؟ فرمایا: ایک تہائی کرسکتے ہو، اور یہ زیادہ ہی ہے، تم اپنے ورثاء کو اغنیاء چھوڑ جاؤ اس سے بہتر ہے کہ انہیں فقیر چھوڑ جاؤ، لوگوں سے ہتھیلی پھیلا کر سوال کریں۔ تم اللہ کی رضاء کے لئے جو بھی خرچ کرتے ہو اس پر ضرور اجر وثواب سے نوازے جاؤ گے، یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی (جو دل بستگی کے لئے) بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: حدیث پاک سے ثابت ہوتا ہے کہ ورثاء چاہے ذوی السہام ہوں یعنی جن کے حصے شریعت میں متعین ہیں یا عصبہ جو ذوی السہام کے متعین حصہ لینے کے بعد پورا مال پاتے ہیں، کسی کو بھی وراثت سے محروم کرنا جائز نہیں ہے، اسی لئے وصیت صرف تہائی مال تک کی ہوسکتی ہے، اس میں بھی شرط ہے کہ ورثاء کے لئے وصیت جائز نہیں ہے، آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ان الله تبارك وتعالى قد أعطى كل ذی حق حقه فلا وصية لوارث ...... قال الترمذی: هذا حديث حسن. وقال المباركفوری: وحسنه الحافظ أيضا فی التلخيص. (التحفة ج٦ ، ص ۳۱۲)

یعنی اللہ تعالی نے (وراثت میں) ہر حق والے کا حق متعین کردیا ہے، اس لئے کسی وارث کے لئے اب وصیت کرنا نہیں ہے۔ (ترمذی شریف، حدیث حسن)

نیز جیتے جی وراثت بانٹ دینا صحیح نہیں ہے، معلوم نہیں مرتے وقت کون کون سے ورثاء بنتے ہیں، ہاں مورث اگر ضرورت سمجھے تو اس بات کی وصیت کرجائے کہ میری متروکہ جائیداد کی شرعی تقسیم ہو، اس کے علاوہ اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

رب العالمین! ہمیں ہر معاملہ میں کتاب وسنت کا عامل بنا، آمین۔ ☆☆☆

افتتاحیہ

دعوت حق کوقبول کرنے میں
رؤساءاور عامۃ الناس میں نفسیاتی فرق

عامۃ الناس اور جمہور اصحاب اقتدار کے تابع اور زیادہ تر کمزور حال ہوا کرتے ہیں، لیکن اس کمزوری کے ساتھ وہ دعوت حق کی قبولیت میں پیش پیش ہوا کرتے ہیں، اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبروغرور اور تسلط واقتدارطلبی کی عادات سے دور ہوا کرتے ہیں جو عادتیں رؤساء کے لئے دعوت حق کی قبولیت میں مانع ثابت ہوتی ہیں، عامۃ الناس کے یہاں یہ نفسیاتی موانع نہیں ہوتے، اسی لئے وہ دعوت حق کوقبول کرنے میں پیش قدمی کرتے ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالی نے ارشادفرمایا ہے:

﴿قال الملأ الذين استكبروا من قومه للذين استضعفوا لمن آمن منهم أتعلمون أن صالحا مرسل من ربه، قالوا انا بما أرسل به مؤمنون﴾ (الاعراف:۷۵)

ان کی قوم میں جومتکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جوکہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا کیاتم کواس کا یقین ہے کہ صالح اپنے رب کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، انہوں نے کہا کہ بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جوان کودے کر بھیجا گیا ہے۔

مکہ میں ہمارے نبی ﷺ کے پیروکار بیشتر کمزور حال لوگ تھے، امام ابن کثیر فرماتے ہیں: ثم الواقع غالبا أن يتبع الحق ضعفاء الناس ۔ (تفسیرابن کثیر۲/۴۴۲) اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ حق کی پیروی کمزورحال لوگوں نے ہی کی ہے، ہرقل نے شام میں حضرت ابوسفیان سے ان کے اسلام لانے سے پہلے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے متعلق دریافت کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ قوم کے رؤساء اس کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور حال لوگ؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ کمزورحال لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں تو ہرقل شاہ روم نے کہا کہ رسولوں کی پیروکار ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں، یہ تفصیل صحیح بخاری کے آغاز ہی میں منقول ہے

عامۃ الناس رؤساء کے مقابل اگرچہ سلیم الفطرت ہوتے ہیں اور دین حق کوتسلیم کرنے میں آگے ہوتے ہیں لیکن متعدد اسباب سے یہ رؤساء کی چالوں میں پھنس جاتے ہیں اور حق کی روشنی سے محروم رہتے ہیں اور ظالم اصحاب تسلط واقتدار کے دست وباز واور مددگار بن جاتے ہیں جیسا کہ فرعون سے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فاستخف قومه فأطاعوه انهم كانوا قوما فاسقين﴾ (الزخرف:۵۴)

اس نے اپنی قوم کو بہلایا پھسلایا اور انہوں نے اسی کی مان لی یقیناً یہ سارے ہی نافرمان لوگ تھے۔

(۱) خوف: رؤساء اور اصحاب اقتدار کے پاس قوت اور جاہ و مال ہوتا ہے اور اس سے عامۃ الناس کو ڈر ہوتا ہے کہ اگر وہ باپ دادا کے مذہب کفر و شرک سے باہر ہوئے تو جان و مال کے خوفناک اذیتوں کا سامنا ان رؤساء کی جانب سے کرنا پڑے گا، قرآن مجید میں فرعون سے متعلق ارشاد ہے:

﴿فما آمن لموسى الا ذرية من قومه على خوف من فرعون وملئهم أن يفتنهم، وان فرعون لعال فى الأرض وانه لمن المسرفين﴾ (یونس:۸۳)

تو موسیٰ پر ان کی قوم میں سے صرف تھوڑے آدمی ایمان لائے وہ بھی فرعون اور اپنے حکام سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں ان کو تکلیف پہنچائے اور واقع میں فرعون اس ملک میں زور رکھتا تھا اور یہ بھی بات تھی کہ وہ حد سے باہر ہو جاتا تھا۔

قوم عاد کے متعلق فرمایا:

﴿ وتلك عاد جحدوا بآيات ربهم وعصوا رسله واتبعوا أمر كل جبار عنيد﴾ (ہود:۵۹)

یہ تھی قوم عاد جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ایک سرکش نافرمان کے حکم کی تابع داری کی۔

(۲) زر و مال کی لالچ: رؤساء قریش نے ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ کو ترک دعوت اسلام پر مال کثیر دینے کی پیش کش کی تھی، اور یہ وصف ہر دور میں عام رہا ہے۔

(۳) طرح طرح کے شبہات سے عامۃ الناس کو رسولوں کی دعوت حق سے پھیرنے کی سعی مسلسل کی جاتی ہے، داعی کو دیوانہ، کم عقل، فساد انگیز، پشتینی عقیدہ کو بگاڑنے والا بتا کر اپنے مال اور جاہ و اقتدار کو اپنی حقانیت کے بطور پیش کیا جاتا ہے، فرعون کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿ونادى فرعون فى قومه قال يا قوم أليس لى ملك مصر وهذه الأنهار تجرى من تحتى أفلا تبصرون، أم أنا خير من هذا الذى هو مهين ولا يكاد يبين﴾ (الزخرف:۵۱،۵۲)

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا اے میری قوم کیا مصر کا ملک میرا نہیں اور میرے (محلوں کے) نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں بلکہ میں بہتر ہوں بہ نسبت اس کے جو بے توقیر ہے اور صاف بول بھی نہیں سکتا۔

حالانکہ اللہ مال و جاہ اپنے محبوب اور غیر محبوب سب کو دیتا ہے لیکن دین حق صرف محبوب لوگوں ہی کو دیتا ہے، ان تمام اسباب ضلالت کے باوجود ہر دور میں بہت سے لوگ متاع جان و مال دنیا گیر آخرت کی دائمی نعمتوں کو ترجیح دیتے ہوئے دعوت حق کو قبول کرتے رہے ہیں، جو یقیناً خوش نصیب اور فلاح پانے والے ہیں۔ ☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

تحریر: ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

ہندوستانی علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں عبقریت کے تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں، دینی علوم پر آپ کی نظر گہری تھی، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن وحدیث کے بہت سے اچھوتے مباحث سے آپ نے قارئین کو روشناس کرایا، اور سنت وبدعت کے باب میں کچھ لوگوں نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اسے بھی اپنی مرصع زبان اور مؤثر اسلوب سے حل کر دیا۔ سیاسی میدان میں آپ کی بصیرت اور فیصلہ کن انداز آج بھی لوگوں کی ستائش وتوجہ کا مرکز ہے، اسلامیانِ ہند اگر حقائق کی روشنی میں فیصلہ کرتے، اور گروہ بندی کی سیاست سے اوپر اٹھ کر اپنی راہ متعین کرتے تو اس شخصیت سے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔

مولانا آزاد ہمارے ملک کے پہلے وزیر تعلیم اور جنگ آزادی کے باعزم وحوصلہ لیڈر تھے، اس لئے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے حلقے بھی ان کی عزت کرتے ہیں اور ان کے نام پر ادارے اور تنظیمات قائم کرتے ہیں، نیز ادبی وسیاسی پروگرام منعقد کرتے ہیں، اس طرح کا ایک پروگرام بنارس سے قریب سارناتھ میں بدھوں کے مرکز ''تبتین انسٹی ٹیوٹ'' میں آج سے تقریباً چودہ سال پہلے ماہ اپریل ۱۹۹۴ء میں منعقد ہوا تھا، اس پروگرام میں خاکسار کو ''مولانا ابوالکلام آزاد قومی اتحاد اور مذہبی غیر جانبداری'' کے موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے مکلّف کیا گیا تھا، مولانا رحمہ اللہ کی شخصیت اور کارناموں پر کچھ عرض کرنا تو زیادہ مشکل نہ تھا، لیکن قومی اتحاد اور مذہبی غیر جانبداری ایسے نقاط تھے جن پر گفتگو الجھاؤ سے خالی نہیں، پھر بھی میں جامعہ سلفیہ کے اپنے بعض رفقائے کار کے ساتھ تبتین انسٹی ٹیوٹ گیا، اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات پیش کئے، پرانے کاغذات میں تقریر کے نقاط ہاتھ لگے تو میں نے ان کو مرتب کر کے محدث میں شائع کرنا مناسب سمجھا۔ واضح رہے کہ عنوان میں ''اتحاد اور غیر جانبداری'' کی جو ابات کہی گئی ہے اس سے متعلق لوگوں کے تاثرات میں جو اختلاف وتنوع موجود ہے اس کا

مجھے احساس ہے، پھر بھی مولانا کی زبان میں بعض باتیں پیش کرنے کو غلط نہیں سمجھتا، کہیں نقص وقصور نظر آئے، یا مولانا کی طرف کوئی غلط موقف منسوب ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔

قومی اتحاداور مذہبی رواداری وغیر جانبداری کے تعارف سے پہلے چند سطور میں مولانا آزاد کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے:

مولانا آزاد کے مختصر حالات

● آپ کا خاندان بابر کے زمانہ میں ہرات سے ہندوستان آیا تھا۔

-آپ کے والد مولانا خیر الدین ہندوستان سے مکہ مکرمہ چلے گئے تھے، پھر علاج کے لئے ہندوستان آئے تو شاگردوں کے اصرار پر یہیں رک گئے، کلکتہ میں ان کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔

-مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، فیروز بخت تاریخی نام اور ابوالکلام محی الدین احمد آزاد پورا نام تھا، شہرت ابوالکلام آزاد سے ہوئی۔

-۲۲رفروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔

-بہت بڑے عالم، خطیب، صحافی، دانشور، مفکر، ماہر سیاست داں، مفسر قرآن، فلسفی، مدبر، قومی رہنما اور جی نی اس تھے۔

-علم اور سیاست و مذہب میں آپ کی خدمات بہت زیادہ اور اہم ہیں، جنگ آزادی کے عظیم سپاہی، وطن دوستی، قومی اتحاد اور ملک کی تعمیر وترقی میں بہت آگے تھے، آپ کی لیڈرشپ پر سب کو بھروسہ تھا، اور آپ سب کی رہنمائی کرتے تھے، آپ بہت دور تک دیکھتے تھے اور انگریزوں کی چال سے واقف تھے، اور ان سے بالکل ڈرتے نہیں تھے۔

● تصنیفات کی تعداد تقریباً سترہ ہے۔

-مولانا آزاد پوری زندگی لکھتے پڑھتے رہے، وزیر بننے کے بعد دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کے کام میں کچھ کمی آگئی تھی لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا، آپ کی کتابوں کے نام: تذکرہ، آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، تحریک آزادی، غبار خاطر، کاروانِ خیال، نقش آزاد، تبرکاتِ آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، ملفوظات آزاد، مولانا کے نام ادبی خطوط وجوابات، نگارشاتِ آزاد، فلسفہ، ترجمان القرآن، خطبات آزاد، قولِ فیصل، مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب، البیرونی اور جغرافیۂ عالم، بتعداد سترہ ۱۷۔

مولانا نے مختلف پرچوں میں کام کیا تھا، اور خود بھی کئی پرچے نکالتے تھے جن میں الہلال اور البلاغ زیادہ مشہور ہوئے۔

● اب ایک نظر قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور غیر جانبداری پر ڈالیے:

راشٹریہ ایکتا یا قومی یکجہتی کے معنی ہیں کہ قوم کے تمام طبقوں اور گروہوں کے افراد ایک دوسرے سے بھائی چارگی کے ساتھ رہیں، ایک ساتھ مل کر کسی اعلیٰ مقصد کے لئے گامزن ہوں۔

قومی یکجہتی کا راستہ خوش دلی، رواداری اور باہمی میل ملاپ ہی سے ہموار ہوسکتا ہے۔

بنیادی بات صرف اتنی ہے کہ مختلف ہونے کے معنی ہرگز ہرگز مخالف ہونا نہیں ہے۔

قومی یکجہتی کے لئے باہمی اعتماد اور بھروسہ ہونا نہایت ضروری ہے، اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے قربت سے، قومی یکجہتی کا سنگ بنیاد مختلف مزاج والے عناصر کی باہمی قربت ہے۔

قومی یکجہتی ہماری ضرورت ہی نہیں وقت کا تقاضا بھی ہے اور تاریخ کی دین بھی۔ اگر کوئی فرقہ پورے ملک کو ایک وردی، ایک عقیدہ اور ایک زبان کے شکنجہ میں رکھنا چاہے یا اپنی من مانی باقی لوگوں پر عائد کرنا چاہے تو وہ صرف نت نئے اختلافات اور ٹکراؤ ہی کے دروازے کھولے گا۔ کوئی گروہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، اور کتنی ہی بڑی اکثریت والا گروہ کیوں نہ ہو، وہ پورا ہندوستان نہیں ہے، اور اسے خود کو پورے ملک کا تنہا نمائندہ کہنے کا ہرگز حق نہیں پہنچتا۔ جواہر لال نہرو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

ہندوستان اینٹ، پتھر، کھیت کھلیان، پیڑ پودے کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کروڑوں ہندوستانیوں کا نام ہے جو یہاں آباد ہیں''۔

ان کروڑوں ہندوستانیوں کے الگ الگ رنگ روپ ہیں، الگ الگ کلچر ہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے کے الگ الگ ڈھنگ ہیں، مگر اس رنگا رنگی کے باوجود ان میں ایک مشترک عنصر موجود ہے، یہ مشترکہ عنصر ہے باہمی رواداری کا احساس اور یہ خیال کہ یہ ملک ان سبھی کا ہے جو یہاں رہتے ہیں اور جنہوں نے اس کی سیاسی آزادی، معاشی ترقی اور تہذیبی نشو ونما میں حصہ لیا ہے، یہ احساس جتنا قوی ہوگا، قومی یکجہتی کی بنیادیں اتنی ہی مضبوط ہوں گی۔ (نیا دور، مارچ و اپریل: ۱۹۹۳ء)

ہندوستان میں مذہبی رواداری سے مراد یہ ہے کہ یہاں کی مختلف ذاتوں، نسلوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے دلوں میں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے لئے محبت ہونا چاہئے بلکہ ہر اس شے کے لئے محبت ہونا چاہئے جو ہندوستانی ہے۔ تمام افراد کو ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہوئے ملک کی سالمیت اور بقا کے لئے اور تمام مذاہب کے درمیان ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے سرگرم عمل رہنا چاہئے۔ (نیا دور، مارچ، اپریل ۱۹۹۳ء)

● ہندوستان میں مذاہب کی کثرت اور ان کے مابین اتفاق ویکجہتی کی ضرورت کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں۔

''ہندوستان مختلف قوموں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قومیں ہندوستان آتی رہی ہیں۔ یہ چاہے فاتح کی حیثیت سے آئی ہوں۔ چاہے سیاح کی حیثیت سے یا تجارت کی غرض سے، یہ ہندوستان آئیں اور یہیں کی ہو رہیں۔ انہوں نے اصل وطن سے قطع تعلق کر کے اس ملک کو ہی اپنا وطن بنالیا اور اس کی مشترکہ قومیت کے لازمی عنصر بن گئے۔ مولانا نے اس حقیقت کو اپنے مارچ ۱۹۴۰ء کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اجلاس رام گڑھ کے خطبہ میں ان حسین وجمیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی، ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے۔ پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا''۔ (ص۲۵۳)

آگے چل کر مولانا نے فرمایا:

''ہم اپنے ساتھ ذخیرے لائے تھے، یہ سرزمین بھی ذخیروں سے مالا مال تھی، ہم نے اپنی دولت اس کے حوالہ کر دی، اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیئے، ہم نے اسلام کے ذخیرہ کی سب سے زیادہ قیمتی چیز یعنی جمہوریت اور انسانی مساوات اسے دی، تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گذر چکی ہیں، اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ کر سکتا ہے جیسا دعوی ہندو مذہب کا ہے، جس طرح آج ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اس طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔'' (ص۲۵۴)

ہندوستان تہذیبوں کی خصوصیت

☆ اس ملک میں صدیوں سے چلی آرہی یکجہتی کی روایت کسی تعارف کی محتاج نہیں، یہ ہمارے ملک ہندوستان کی وہ

تہذیب ہے جو ہمیشہ سے ہمارا سرمایۂ افتخار رہی ہے۔

اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری دھرتی نے ہر اس قوم اور قبیلہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا جس نے اس دھرتی کو اپنا وطن جانا اور یہاں سکونت اختیار کی، یہاں سکونت کا مطلب وہ وطنیت اور زمین سے وہ رشتہ ہے جو اس سرزمین پر رہنے والوں کی اصل پہچان بن جاتا ہے۔

آریہ، یہودی، مجوسی، یونانی اور مسلمان الگ الگ مذہب وملت اور مختلف اقوام کے لوگ تھے لیکن یہاں آکر سب آپس میں گھل مل گئے کہ ان کے درمیان مذہب، زبان اور رسم ورواج کے فاصلے کم سے کم ہوتے چلے گئے، اس اختلاط اور میل جول نے ایک ایسی تہذیب کو پروان چڑھایا جو سب کی مشترک تہذیب تھی، یکجہتی کی اتنی روشن مثال شاید ہی دنیا میں کہیں اور ہو۔ (نیادور، اپریل ۱۹۹۳ء)

ہندو مسلم اتحاد

سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مولانا آزاد نے ہندوستانی سیاست کے سب سے بڑے مرض کی تشخیص کرلی تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو تفرقہ پیدا کیا ہے وہ ان دونوں مذہبی گروہوں ہی کے لیے نہیں پوری قوم کے لیے خطرناک ہے۔

ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان بھائی چارے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد نے انڈین نیشنل کانگریس کے مارچ ۱۹۴۰ء کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں کہا تھا: ''میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمانوں ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون اور اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تقویم (بناوٹ) کا ایک

ناگزیر عامل ہوں۔''

ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب اور متحدہ قومیت کا تصور

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے اس کی ایک عظیم خوبی ہے کہ یہاں ہر پرانے زمانے سے مختلف مذاہب کے ماننے والے آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔مولانا آزاد نے ہندوستان کی اس خصوصیت کو سامنے رکھتے ہوئے متحدہ قومیت کا اپنا تصور پیش کیا ہے اور اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اس متحدہ قومیت کو ختم کرنے کی کوئی بھی کوشش اس ملک اور یہاں کے بسنے والوں کے لئے بیحد مضر ہوگی۔مولانا اپنے صدارتی خطبے میں کہتے ہیں:

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ گئی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے، مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدقومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی، ہم میں اگر ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندوزندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرہ کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشا سے لائے تھے تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہوجائیں بہتر ہے، کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے......ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے''۔

متحدہ قومیت مولانا کا عقیدہ تھا۔ان کی ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کا اعلاترین نمونہ تھی۔انہوں نے اس اتحاد کے لئے خود بھی جد وجہد کی اور دوسروں کو بھی ترغیب دی، انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۵؍دسمبر ۱۹۲۳ء کے خصوصی اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے مولانا نے کہا:''آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان

کردے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائیں تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔''

☆مولانا آزاد کی نظر میں متحدہ قومیت کا تصور اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں تھا، ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد غالباً پہلے جلیل القدر مسلم رہنما تھے جس نے زور وقوت کے ساتھ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا تصور پیش کیا اور اسے ملک کے عوام وخواص میں رائج وراسخ کرنے کے لیے اپنی تمام تر ذہنی، علمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کردیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے عالمگیر انسانی اخوت ومساوات پر بھی زور دیا اور اس سلسلے میں نہ صرف علمی اور عقلی دلائل سے کام لیا بلکہ اپنی جماعت کے مفروضات سے بھی رجوع کیا، انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ خدا کے نزدیک ایک انسان کو دوسرے انسان پر یا ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی برتری اور کوئی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے تو صرف اس کے صالح کردار وعمل کی بنیاد پر، دوسری کوئی بنیاد اس برتری اور فضیلت کی قائم نہیں کی جاسکتی، انہوں نے مسلمانوں کو یہ بھی یاد دہانی کرائی کہ جس خدا پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس کی صفت رب العالمین ہے، اور جس جلیل القدر پیغمبر نے اس خدا کا پیغام تم تک پہنچایا ہے اسے اس نے رحمۃ للعالمین کہہ کر مخاطب کیا ہے:" وما ارسلنٰك الا رحمة للعالمين" (اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر)۔

اقوام عالم کو پوری انسانی برادری کا حصہ قرار دینا، آج کے بڑے بڑے سیاست دانوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ اس وقت کہا جب رنگ ونسل کی تفریق اور ادنی مفادات کے پیدا کیے ہوئے باہم متصادم نظری اور عملی اختلافات نے اس طرف متوجہ ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی، پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرنا بے انصافی ہوگی کہ موجودہ سیاستین جب اس قسم کی مفاہمانہ باتیں کرتے ہیں تو ان کے لہجے کی سطحیت اور منافقت آلودگی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، جب کہ مولانا آزاد کی زبان پر یہ الفاظ ان کے دل ودماغ کے عمیق ترین اور شفاف ترین گوشوں سے نکل کر آئے تھے۔'' (شخصیت اور کارنامے: ۲۳۵، ۲۳۶)

مشترکہ تہذیب پر یقین

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے عقیدہ پر مولانا آزاد کے خیالات واضح صورت میں جگہ جگہ ملتے ہیں:

''صدیوں کی مشترکہ تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے، ہماری

زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترکہ زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو، یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔''

آخر میں کہتے ہیں:

''ہماری ایک ہزار برس کی اس مشترکہ زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے، ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کی مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں، اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے، اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔'' (شخصیت اور کارنامے: ص ۲۰۴)

● جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مولانا آزاد نے اس مشترکہ تہذیب کا ذکر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء کے اپنے خطبہ میں کیا ہے:

''ہندوستان کے لئے قدرت کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے، ہندوستان کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لئے جگہ نکالی۔

ان دونوں ''ہندو مسلمان) کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا، جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا''۔ (ص ۲۵۳)

مولانا ہندوستان پر مسلمانوں کے حق کے قائل ہیں:

''اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ کر سکتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے، جس طرح آج ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔'' (ص ۲۵۴)

(جاری)

☆☆☆

گوشۂ خواتین

پردے کے احکام وآداب

حافظ صلاح الدین یوسف

پردے کا حکم مردوں سے اختلاط کی ممانعت:

مسلمان عورت کے لئے پردے کا حکم بھی ان امتیازات میں سے ہے جس میں وہ مردوں سے ممتاز اوراس کی وجہ سے اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز ہےاور مقصد اس سے مسلمان عورت کا تحفظ ہے۔مسلمان عورت کی عزت وناموس اوراس کی کرامت ونجابت کی حفاظت اوراس کوشبہات سے بچانے کے لئے اللہ تبارک وتعالی نے ایک تو مرداورعورت کو باہمی اختلاط (مل کر پڑھنے ،مل کر کام کرنے ،مل کر بے محابا گفتگو کرنے اور بے باکانہ میل ملاقات) سے روک دیا ہےاور دوسرے عورت کے لئے حجاب (پردے) کی پابندی کوضروری قرار دیا ہے۔پس عورت کے لئے پردہ ایسے درخت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے سائے میں وہ سکون محسوس کرتی اوراس کے دامن میں پناہ حاصل کرتی ہے۔

حجاب کوئی قید اور قدغن نہیں جس سے گھٹن محسوس کی جائے کوئی بوجھ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کی جائے اورکوئی ناروا پابندی نہیں جس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے جیسا کہ اسلام دشمن عناصر، لادین قسم کےلوگ اور مغرب زدہ حضرات باور کراتے ہیں بلکہ پردے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نے عورت کوایک نہایت بیش قیمت متاع قرار دیا ہےاسی لئے اس کی حفاظت وصیانت کا خصوصی اہتمام کیا ہے، کیونکہ ہر قیمتی چیز کو چھپا کر رکھا جاتا اوراس کی حفاظت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس لئے دشمنوں کے مکر وکید کو سمجھنا اوران کے حسین جالوں سے بچنا اوران کی سازشوں کو ناکام بنانا ضروری ہے۔

بنابریں ہر مسلمان عورت حجاب کے شرعی تقاضوں کی پابندی کر کے اپنے ایمان کی بھی حفاظت کرےاور دشمنان اسلام کے مذموم اورمکروہ عزائم کوبھی خاک میں ملادے۔

پردے کی اہمیت اوراس کی افادیت وضرورت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور مارکیٹ میں اس موضوع پر بہت مواد موجود ہےاس لئے ذیل میں صرف شرعی پردے کے آداب وشرائط اوراختلاط کی ممانعت کےضروری مسائل بیان کئے جاتے ہیں تا کہ ہر مسلمان عورت ان کو سامنے رکھےاوران کی پابندی کرے۔مردوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جوان بچیوں،

بہنوں، ماؤں اور بیویوں کوتلقین کریں کہ وہ ہر جگہ (گھر کے اندر ہوں یا گھر سے باہر) ان پابندیوں کا اہتمام کریں۔

پردے کا حکم اور اس کے آداب:

عورت کو پردے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے تقاضوں کی ادائیگی کے لئے علماء نے اس کے آٹھ آداب بیان فرمائے ہیں تاکہ صحیح معنوں میں پردہ ہو سکے۔ ان آداب وشرائط کے بغیر شرعی پردہ نہیں ہوتا۔ یہ آداب حسب ذیل ہیں:

☆ چادر یا برقع ایسا ہو جو سر سے لے کر پیروں تک پورے جسم کو ڈھانپ لے، چہرہ نظر آئے نہ بازو، چھاتی نظر آئے نہ گردی، حتی کہ ہاتھ اور پیر بھی نظر نہ آئیں۔

☆ چادر یا برقع بھی بجائے خود زینت یعنی جاذب نظر نہ ہو، جیسے اس پر کڑھائی کا کام کیا گیا ہو یا پر کشش رنگ کا حامل ہو یا اتنا خوبصورت اور نفیس ہو کہ بے اختیار مردوں کی نظریں عورت کی طرف اٹھ جائیں۔ گویا مذکورہ قسم کی چادر یا برقع سے بھی پردے کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔

☆ حجاب ایسے باریک یا شفاف کپڑے کا نہ ہو جس میں عورت کا جسم جھلکے گویا چادر یا برقع کا کپڑا سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ موٹا بھی ہو۔

☆ حجاب ڈھیلا ڈھالا ہو، اس طرح تنگ نہ ہو کہ جسم کا انگ انگ اس سے نمایاں ہوتا ہو، یا فتنے میں ڈالنے والی جگہیں واضح ہوں یا اس سے جسمانی ساخت اور اس کے خدوخال کی غمازی ہوتی ہو۔

☆ اس کے کپڑے سینٹ یا خوشبو سے معطر نہ ہوں۔

☆ مَردوں کے لباس کی طرح نہ ہو۔

☆ اسی طرح کافر عورتوں کے لباس کی طرح نہ ہوں، جیسے منی اسکرٹ یا ساڑی، لہنگا وغیرہ۔

☆ اس لئے کہ کافروں کی مشابہت بھی ممنوع ہے۔ "من تشبہ بقوم فھو منھم" (ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھر ۃ، حدیث: ۴۰۳۱) اور جو جس کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہیں میں سے ہوگا۔

☆ شہرت ونا موسی والا لباس نہ ہو، اس لئے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "من لبس ثوب شھرۃ البسہ اللہ یوم القیامۃ مثلہ" (زاد عن ابی عوانۃ) "ثم تلھب فیہ النار" (ابوداؤد: حدیث ۴۰۲۹) جس نے شہرت کا لباس پہنا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس جیسا ہی لباس پہنائے گا پھر اس میں جہنم کی آگ کو بھڑکا دیا جائے گا۔

کن کن لوگوں سے پردہ ضروری اور اختلاط (میل جول) منع ہے:

لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لئے پردہ اسی وقت ضروری ہے جب وہ گھر سے باہر نکلے اور اسی طرح میل جول بھی

صرف انہیں سے منع ہے جو بیگانے ہیں، ورنہ گھر میں وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ جس طرح چاہے رہے، پردے کے منافی نہیں۔اسی طرح اپنے رشتے داروں کے ساتھ جس طرح میل جول رکھے ان سے ہنسی مذاق کرے اوران سے خلوت وجلوت میں بے باکانہ گفتگو کرے اس میں کوئی حرج نہیں، یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔

ایسے گھروں میں جہاں خاوند کے دوسرے بھائی بھی رہتے ہوں عورت کو ڈھیلے ڈھالے اور ساتر لباس میں رہنا چاہئے جس سے عورت کے بازو نظر نہ آئیں نہ چھاتی نہ گدی وغیرہ۔اسی طرح عورت کے لئے دیوروں اور جیٹھوں سے پردہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ پردہ اس طرح نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک تو مذکورہ انداز میں ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے جس سے اس کی زینت کا اظہار اور فتنے کی جگہیں آشکارانہ ہوں، دوسرے دیور اور جیٹھ وغیرہ کے سامنے آنے پر گھونگٹ نکال لے، علاوہ ازیں ان سے بے باکانہ انداز میں گفتگو نہ کرے بلکہ حسب ضرورت مختصر بات کرے اور ان کے ساتھ تنہائی بالکل نہ اختیار کرے۔

حسب ذیل رشتہ داروں اور لوگوں سے اختلاط ممنوع ہے:

بہرحال شرعی ہدایت کی روشنی میں جن جن رشتے داروں سے پردہ کرنا ضروری اوران سے اختلاط منع ہے ان کی تفصیل علماء کی وضاحت کی روشنی میں حسب ذیل ہے:

☆ چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی کا اپنی چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد اور پھوپھی زاد بہن سے اختلاط۔

☆ عورت کا اپنے دیور، جیٹھ، بہنوئی سے اختلاط۔

☆ عورت کے رضاعی بھائی کا اپنی رضاعی بہن کی بہنوں سے اختلاط۔

مذکورہ تمام اختلاط ممنوع ہیں، اختلاط کا مطلب ان سے بے پردہ ہوکر بلاتکلف گفتگو اور ہنسی مذاق کرنا اور خلوت میں بھی ان سے ملاقات کرنا ہے۔

☆ منگیتر کا اپنی منگیتر سے اختلاط بھی ممنوع ہے، البتہ نکاح سے قبل ولی کی موجودگی میں اسے ایک نظر دیکھ لینا مستحب ہے۔

☆ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بیروں اور لڑکوں کو عورتوں کی خدمت پر مامور ہونا۔

☆ نکاح کے بعد دولہا کا اپنے رشتے داروں کے ساتھ لوگوں کے سامنے گروپ کی صورت میں بیٹھنا اور تصویریں اتروانا۔

☆ اسی طرح دولہا دلہن کے رشتے داروں کا عورتوں کے سامنے گروپ بنا کر بیٹھنا وغیرہ۔

☆ عمر رسیدہ خواتین کا اجنبی مَردوں کے ساتھ تنہائی میں خلوت اختیار کرنا۔

☆ عورت کا اجنبی مَردوں کے ساتھ اختلاط یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ہمارے ہی قبیلے یا برادری کے افراد ہیں۔

☆ یا اس نقطۂ نظر سے مَردوں سے اختلاط کہ اصل پردہ تو دل کا پردہ ہے، یعنی دل پاکیزہ ہوں آنکھوں میں حیا ہو تو یہی پردہ ہے، جسمانی پردہ ضروری نہیں۔

☆ ان بچیوں کے ساتھ اختلاط میں تساہل جو قریب البلوغت ہوں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ تو ابھی بچیاں ہیں۔

☆ ٹیکسی، رکشے میں اکیلی عورت کا سفر کرنا جب کہ ڈرائیور اجنبی ہو۔

☆ بغیر محرم کے عورت کا حج کے سفر پر جانا۔

☆ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ مل کر پڑھنا اور اسی طرح جامعات کی دیگر سرگرمیوں میں ان کا باہم اختلاط۔

☆ کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر مدارس میں بلا حجاب عورتوں کا مَردوں کو پڑھانا یا مَردوں کا عورتوں کو پڑھانا۔

☆ حتی کہ پرائمری کلاسوں میں بھی عورتوں کا بچوں کو پڑھانا بتدریج اختلاط کی راہ ہموار کرنا ہے۔

☆ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے نام پر مغرب کی یونیورسٹیوں میں بھیجنا، ان کو مغربی افکار اور اس کی حیا باختہ تہذیبوں کا شکار بنانا ہے۔

☆ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں عملی تربیت کے نام پر لڑکے لڑکیوں کا اختلاط۔

☆ یونیورسٹیوں میں ایم، اے اور پی، ایچ، ڈی وغیرہ کے مقالات کی تیاری میں بطور رہنما اور نگراں کے مردوں کا عورتوں کے ساتھ خلوت (تنہائی) میں میل ملاقات۔

☆ علمی اجتماعات، کانفرنسوں، مشاعروں اور دیگر اس قسم کی تقریبات میں مرد وعورت کا پہلو بہ پہلو بیٹھنا۔

☆ نرسوں اور خاتون ڈاکٹروں کا اجنبی مَردوں، حتی کہ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے دیگر مرد ملازمین کے ساتھ اختلاط۔

☆ ڈاکٹر کی نرس یا لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ خلوت۔

☆ بغیر حاجت یا ضرورت کے یا لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی میں عورت کا مرد ڈاکٹر کے سامنے چہرہ وغیرہ ننگا کرنا۔

☆ استقبالیہ یا الوداعی مجلسوں میں عورتوں کا مَردوں کے ساتھ اختلاط۔

☆ طبی تجربہ گاہوں سے عملی تربیت کے عنوان پر مَردوں اور عورتوں کا اختلاط۔

☆ کھیل کود کے میدانوں اور مواقع پر عورتوں کا مَردوں سے اختلاط۔
☆ ہوٹلوں یا کھانے پینے کی دیگر تقریبات میں عورتوں اور مردوں کا اختلاط۔
☆ دکان یا شوروم وغیرہ میں عورت کا مَردوں سے اختلاط یا خلوت۔
☆ مارکیٹوں میں عورتوں کا مَردوں سے اختلاط۔
☆ بغیر محرم کے عورت کا بس، ریل، یا ہوائی جہاز میں سفر کرنا۔
☆ عورتوں کا فوٹو گرافروں سے تصویر کھنچوانا۔
☆ دینی اجتماعات یا اس کے نام پر منعقد ہونے والے پروگراموں میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط۔
☆ مرد ٹیوٹر کا کسی بھی عمر کی بچیوں کو پڑھانا عورت ٹیوٹر کا لڑکوں کو پڑھانا۔

اختلاط کی مذکورہ تمام صورتیں اور اس قسم کی دوسری صورتیں جن کی شرعا اجازت نہیں، سب ممنوع اور حرام ہیں۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں بے پردگی وبائے عام کی شکل اختیار کرگئی ہے، جس کی وجہ سے اب مَرد وعورت کے اختلاط میں لوگ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے بے پردگی کے ساتھ ساتھ اختلاط کا فتنہ بھی بڑھتا جا رہا ہے، حالانکہ جب بے پردگی ہی جائز نہیں تو پھر اختلاط کا جواز کیوں کر ممکن ہے؟ تو یہ بنائے فاسد علی الفاسد کی واضح صورت ہے۔

بنابریں مسلمان عورتوں کا اختلاط کی مذکورہ صورتوں سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مَردوں کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی بیوں، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو پردے کی اہمیت وضرورت سے بھی آگاہ کریں اور بے پردگی اور مَردوں سے اختلاط کے مفاسد وخطرات سے بھی انہیں خبردار کریں، تاکہ وہ ان سے بچنے کا اہتمام کریں۔

ملحوظہ:

عورت کا جن مَردوں سے اختلاط ممنوع اور ان سے پردہ ضروری ہے ان سے مراد اجنبی مرد ہیں، اور اجنبی مرد کون ہیں؟ تو یاد رکھیئے۔ خاوند اور محرم کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب شریعت کی رو سے اجنبی ہیں اور محرم کون کون ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں وہ حسب ذیل ہیں:

نسبی محارم: باپ، بھائی، دادا، نانا، بیٹا، پوتا، نواسہ، چچا، ماموں، بھانجا اور بھتیجا۔

سسرالی محارم: سسر، داماد، خاوند کا بیٹا۔

رضاعی محارم: رضاعت سے ثابت ہونے والے مذکورہ رشتے، کیونکہ حدیث میں ہے: رضاعت سے بھی وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے ہوتے ہیں'' (صحیح مسلم کتاب الرضاع باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ:

حدیث۱۴۴۴)

ان مذکورہ رشتوں میں سے کسی کے ساتھ عورت کا نکاح نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ سب عورت کے محرم ہیں۔ان سے پردہ کرنا ضروری نہیں ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں سب غیرمحرم ہیں ان سے پردہ کرنا ضروری ہے۔

مثالی مسلمان عورت کی صفات:

اے مسلمان بہن! اپنی حیثیت اوراس عزت وتکریم پرغور کرجس سے اللہ نے تجھے نوازا ہے، ہر قیمتی چیز کا اگر وہ ٹوٹ جائے یا ضائع یا چوری ہوجائے بدل ممکن ہے لیکن اگر تیری عفت وعصمت داغدار ہوجائے، تیری عزت وتکریم کو بٹہ لگ جائے اور تیری شرافت ونجابت موضوع بحث بن جائے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔اس لئے تیرا سب سے قیمتی جوہر، تیری عفت وعصمت ہے جولٹ جائے تو کوئی اس کا معاوضہ نہیں دے سکتا۔

یہ تیری ردائے تقدس ہے جو تار تار ہوجائے تو اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔تیرا آبگینۂ ناموس ہے جوٹوٹ جائے تو کوئی اسے جوڑ نہیں سکتا۔پس تیری عزت اسی میں ہے کہ تو اپنی عصمت کی، اپنے تقدس کی چادر کی اور اپنے ناموس کے آبگینے کی حفاظت کر۔یہ حفاظت کس طرح ممکن ہے؟ یہ اس طرح ممکن ہے کہ تو کچھ چیزوں کو اختیار اور کچھ چیزوں سے اجتناب کر۔

اختیار کرنے والے اہم کام:

مسلمان عورت کے لئے جن چیزوں کو اختیار کرنا اور اپنانا لازم ہے وہ حسب ذیل ہیں:

☆ تجھے محبت ہو صرف اللہ سے، اللہ کے رسول ﷺ سے اوران لوگوں سے جو اللہ کے دین کے پابند ہیں۔

☆ تیری خلوت ہو، آخرت کی یاددہانی اور ایسے اعمال پرغور کرنے کے لئے جو تیری قبر سے ظلمتوں کو دور کرنے کا باعث اور لحد کی تنگیوں کو فراخی میں بدلنے کا ذریعہ ہوں۔

☆ تیری سہیلیاں صرف وہ ہوں جو مسلمان اور مومن ہوں، اللہ کے دین کی مکمل پابند ہوں۔

☆ تیرے دشمن ہوں ہرقسم کے گانے اور بجانے کے آلات (ریڈیو، ٹی وی، فلمیں، وی سی آر، اور ویڈیو وغیرہ) موسیقی کے آلات، تمام وہ رسائل واخبارات جو بے حیائی پرمبنی مضامین، تصویریں اور گمراہ کن افکار وتصورات شائع کرتے ہیں، بے پردہ اور کھلے عام زیب وزینت کا اظہار کرنے والی ہرعورت اور ہر وہ شخص جو رب کی ناراضی پرمبنی کام کرنے والا ہو۔

☆ تجھے نفرت ہو یہود ونصاریٰ سے، منافقین سے، لادینوں سے اور آزادیٔ نسواں کے پُرفریب نعرے لگا کر عورتوں کو گمراہ کرنے والوں سے۔

☆ تجھے حرص ہو خالص اور سچی توبہ کی، اور اس کے اداب وشرائط کے ساتھ، نہ کہ محض زبان سے جھوٹی توبہ کی۔

☆ تیرا مقصد زندگی ہو انابت الی اللہ، بارگاہ الٰہی میں استغفار، آخرت کی تیاری اور رضائے الٰہی کا حصول۔

☆ تیری شادی بیاہ کی تقریبات پاک ہوں جاہلانہ رسوم سے، بینڈ باجوں سے پٹاخوں سے اور آتش بازی کے خطرناک مظاہرے سے، میوزک کی دھنوں سے رقص وسرود کی محفلوں اور شراب کی سرمستیوں سے، ویڈیو سے، زیورات اور کپڑوں کی نمائش اور میک اپ کے ذریعہ سے برپا ہونے والے نور ونکہت کے طوفان سے، جہیز کی مسرفانہ رسموں سے، بے پردگی اور مَردوں کے اختلاط سے۔

☆ تیری آرزو، خواہش اور کوشش ہو ایک مسلمان خاندان کی بنیاد ڈالنے کی، اپنی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کرنے کی اور اس میں اسلامی روح وجذبہ پیدا کرنے کی۔

وہ کام جن سے اجتناب کرنا ضروری ہے:

اور مسلمان عورت کو جن چیزوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے وہ حسب ذیل ہیں:

☆ دینی اقدار وروایات کا استہزاء کرنے اور کرنے والوں سے اجتناب۔

☆ دین میں بدعات ایجاد کرنے اور بدعات میں حصہ لینے سے اجتناب۔

☆ نماز کے چھوڑ دینے یا اس میں غفلت وتساہل اختیار کرنے یا بلا وجہ اس میں تاخیر کرنے سے اجتناب۔

☆ غیبت، لعن طعن اور چغلخوری سے اجتناب۔

☆ کافر اور مغرب کی اخلاق باختہ عورتوں کی تقلید سے ان کی محبت سے اور ان کو اچھا سمجھنے سے اجتناب۔

☆ بغیر ضرورت کے گھر سے نکلنے سے اجتناب۔

مذکورہ تمام باتوں سے اجتناب مثالی عورت بننے کے لئے ضروری ہے۔

یہ چند ضروری ہدایات ہیں جن کی مخاطب ہر مسلمان ماں، بہن، بیٹی، طالبہ واستانی، جوان اور بوڑھی ہے۔ ان میں دین ودنیا کی سعادتیں ہیں ان پر عمل کرکے ان سعادتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور فوز وفلاح کو اپنا مقدر بنالیں۔

وبالله التوفيق وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم.

☆☆☆

جمعیت علماء ہند کی تاسیس میں
علمائے اہل حدیث کا بنیادی کردار

مولانا عبدالوہاب خلجی

عصر حاضر میں برصغیر کے عظیم مؤرخ، مفکر و دانشور اور ممتاز عالم دین علامہ محمد اسحٰق بھٹی حفظہ اللہ لکھتے ہیں: ''آزادی کبھی ایک ہی دروازے اور ایک ذریعہ سے نہیں آتی بلکہ مختلف دروازوں سے صحن چمن میں داخل ہوتی ہے اور اپنی بہار دکھاتی ہے برصغیر ہندو پاک کی آزادی کا بھی یہی حال ہے یہ بھی بہت سی تحریکوں اور مختلف عناصر کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے''۔

جمعیت علماء ہند کے حالیہ بحران، داخلی کشمکش اور انتشار میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ جمعیت علماء جسے تاریخ ساز، آزادی وطن کے ہیرو اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا مظہر قرار دیا جارہا ہے وہ کسی ایک مدرسۂ خیال، چند ایک مخصوص شخصیات یا محض ایک گھرانے کی کدوکاوش نہیں بلکہ اسے تاریخ ساز اور مسلمانوں کی متفقہ آواز بنانے میں مختلف افکار ونظریات کے علماء و زعماء کی قربانیاں شامل ہیں جس میں علماء اہل حدیث کا بنیادی کردار عمل ہی نہیں بلکہ اس کی تحریک وتجویز میں ان کی ہی پہل رہی ہے۔ جسے نظر انداز یا کسی مخصوص طبقہ فکر میں محصور کرنا عدل وانصاف کے خلاف اور تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد وزیر ہند ''منٹو مارلے'' ہندوستان آئے وہ ہندوستانیوں کے لئے ایک اسکیم جسے سیاسی زبان مین ''منٹو مارلے اسکیم'' کہا جاتا ہے لے کر آئے تھے۔ اس ضمن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک سے علماء کرام کا ایک اجتماع لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مسلمانان ہند کے مذہبی معاملات سے متعلق کچھ تجاویز پر غور کے لئے علماء کا ایک وفد وزیر ہند سے ملاقات کرے۔

لکھنؤ کے اس اجتماع میں جماعت اہل حدیث کے ممتاز عالم دین، مناظر وقت شیخ الاسلام مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری جو نہ صرف سرخیل اہل حدیث تھے بلکہ مجموعی طور پر مسلمانوں میں ان کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا نے تجویز پیش کی کہ ملکی سیاسیات کے مذہبی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے علماء کی باقاعدہ ایک تنظیم قائم کرنی چاہئے علامہ امرتسری کی اس تجویز پر دو دن تک بحث ہوتی رہی لیکن یہ اجتماع بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہوگیا۔

کچھ عرصہ بعد دہلی میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا جس میں ملک کے بہت سے علماء شریک تھے علامہ امرتسری نے اس جلسے میں پھر تنظیم علماء سے متعلق اپنی وہی تجویز پیش کی جسے موصوف لکھنو کے اجلاس میں پیش کر چکے تھے، جس کی پذیرائی ہوئی اور

متعدد علماء نے ان کی تائید فرمائی۔ مولانا نے فرمایا:

''ہندوستان میں مختلف گروہوں، قوموں کی تنظیمیں اور انجمنیں قائم ہوچکی ہیں اور قائم ہوتی رہتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ ملک وقوم کی خدمت کررہی ہیں۔ لیکن علماء کی کوئی ایک ملک گیر تنظیم نہیں ہے جو متفقہ طور پر ملک اور قوم کی خدمت کرسکے۔ بہتر ہوگا کہ علماء کی ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو پیش آمدہ مذہبی اور سیاسی معاملات میں اسلام کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کے فرائض انجام دے، اس سے علماء کا وقار بھی بلند ہوگا اور آپس کے مذہبی اور مسلکی جھگڑوں کا سلسلہ بھی ماند پڑ جائے گا۔ نیز اس طرح علماء کی وساطت سے اسلام کی آواز زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر شکل اختیار کرلے گی۔ چنانچہ غور وفکر کے بعد ''جمعیت علماء ہند'' کے نام سے ایک جماعت معرض وجود میں لانے کا فیصلہ کیا گیا''۔

یہ نومبر ۱۹۱۹ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخری دنوں میں امرتسر میں مجلس خلافت اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے جس میں خلافت اور ترکی مسئلہ پر بحث ہونے والی تھی جن کا تعلق خاص دینی، علمی اور فقہی نوعیت کا تھا جس کے پیش نظر اس پر گفتگو اور مباحثہ کے لیے ملک بھر سے علماء کرام کی بڑی تعداد کی شرکت متوقع تھی چنانچہ اس مناسبت سے اعیان واکابر اہل حدیث حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہما اللہ نے دہلی کی اس مجلس علماء کو دسمبر میں امرتسر تشریف لانے کی دعوت دی اور تحریک پیش کی کہ اس موقعہ پر جمعیت علماء ہند کے قیام اور توثیق کے سلسلہ میں ضروری اور اہم بنیادی مسائل طے کرلیے جائیں۔

دہلی کے اس اجتماع علماء میں جس میں جمعیت علماء ہند کا ڈھانچہ تیار ہوا تھا بہت سے علماء کرام شریک تھے، جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سلامت اللہ جیراج پوری، مولانا سید محمد فاخرالہ آبادی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد اکرم خاں، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا آزاد سبحانی قابل ذکر ہیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس اجتماع میں شریک نہیں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود حسن اور مولانا حسین احمد مدنی ان دنوں نظر بند تھے، اور مولانا شبیر احمد عثمانی کسی اور وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہوسکے تھے۔

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے جمعیت علماء کی تاسیس کے لیے تحریک شروع کی، مختلف اجتماعات، جلسوں، کانفرنسوں اور اپنے ہفت روزہ اخبار اہل حدیث امرتسر میں لکھتے رہے۔ وہ اس واسطے سے مختلف فقہی مسالک کے حامل اہل علم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلکی تعصب ختم ہو اور سب لوگ صلح وصفائی سے زندگی بسر کریں۔ نیز اس وقت ہندوستان میں سیاسی وعلمی نوعیت کے بعض بڑے بڑے مسائل زیر بحث تھے، ان کے بارے میں مولانا ممدوح کے نزدیک علماء ہند کا متفقہ طور سے غور کرنا ضروری تھا۔ ان کی سعی وکوشش سے اس مقصد کے لیے جمعیت علماء ہند کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اجلاس دہلی کے فیصلے کے مطابق ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں علماء ہند کا اجتماع شروع ہوا، جس میں باون علماء کرام شریک ہوئے۔ ان میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا محمد یحیٰ غزنوی، مولانا عبدالغفار غزنوی، مولانا ابوتراب عبدالحق امرتسری، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد موسیٰ غزنوی، مولانا محمد عیسیٰ غزنوی، حکیم نورالدین لائل پوری، مولانا سلطان محمود، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب قصوری اور کئی دوسرے علماء عظام شامل تھے۔

اجلاس کی مجلس استقبالیہ میں علامہ ثناء اللہ امرتسری نے خطبہ استقبالیہ پڑھا جس میں قیام جمعیت اور اجلاس دہلی کی مختصر کیفیت بیان کی۔ مختلف حضرات کی تقریروں اور بحث وتمحیص کے بعد اس بات کی توثیق کی گئی کہ اجلاس دہلی کے فیصلے کے مطابق علماء ہند کی اس جماعت کا نام ''جمعیت علماء ہند'' ہی رکھا جائے۔ جس کی صدارت کے لیے علامہ امرتسری نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید دہلوی کا نام ناظم عمومی کے لیے پیش کیا جس کی تائید مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا محمد اکرام ڈھاکہ نے کی۔ اس اجلاس میں تیئس ارکان پر مشتمل ایک مجلس عاملہ تشکیل کی گئی جس میں ملک کے تمام صوبوں کو الگ الگ نمائندگی دی گئی تھی۔

اس اجلاس میں حکیم محمد اجمل خاں نے بھی شرکت فرمائی جو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے امرتسر تشریف لائے تھے۔ حکیم صاحب نے مجمع علماء میں تقریر کرتے ہوئے علماء کے جذبہ اتحاد کی تحسین کی اور جمعیت علماء ہند کے قیام وتاسیس پر ان کو ہدیہ تبریک پیش کیا۔ حکیم صاحب کی موجودگی میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ نے جمعیت کے اغراض ومقاصد کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ حکیم صاحب نے تحریک کی کہ جمعیت کے اساسی اصول وضوابط کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ چنانچہ بالاتفاق مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد اکرم خاں، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا خیرالزماں صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی جس نے جمعیت کے اصول وضوابط کا مسودہ تیار کرکے دوسرے روز ہی یکم جنوری ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں پیش کیا جو منظور کرلیا گیا۔ اسی اجلاس میں حکومت برطانیہ سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا جو ان دنوں نظر بند تھے۔

دہلی میں علماء کے جس اجتماع میں جمعیت کا تصور پیش کیا گیا تھا اس کو روبعمل لانے کے علامہ امرتسری نے مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید دہلوی کو امرتسر تشریف لانے کی دعوت دی تاکہ وہاں مستقل طور سے جمعیت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس سلسلہ میں خود مولانا کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''اسی امید پر میں ان دونوں صاحبوں مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کو جمعیت علماء کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے امرتسر آنے کی دعوت دے آیا تاکہ امرتسر میں اعیان اسلام سے جمعیت علماء میں شرکت کی تحریک کی جائے۔ اسلامیہ ہائی

اسکول کی ایک کوٹھری میں ان دونوں صاحبوں کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ان کے ساتھ تیسرا میں (داعی) تھا۔یہ کوٹھری کیا تھی گویا غار ثور کا نمونہ تھی۔ہاں ان دونوں مقاموں میں امتیاز یہ تھا کہ وہاں دو پاک ہستیاں تشریف فرما تھیں اور یہاں تین گنہگار مغفرت کے امیدوار بیٹھے تھے۔جمعیت کی اس شوری کے اجلاس میں پہلا ریزولیوشن مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ کی رہائی کے متعلق پاس ہوا''۔

اس سے آگے فرماتے ہیں:''ان اصحاب ثلاثہ میں سب سے پہلے یہ تجویز پاس ہوئی کہ حضرت ممدوح کی رہائی کے لیے وائسرائے کو تار دیا جائے،تار کے خرچ کا اندازہ تین روپے کیا گیا۔یہاں پہنچ کر میں بڑی مسرت کے ساتھ یہ بات ظاہر کرتا ہوں کیونکہ میں اس امر کو اپنے لیے باعث عزت اور موجب فخر جانتا ہوں کہ تار کا سارا خرچ میں نے ادا کیا''۔

جمعیت علماء ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس آئندہ سال ۱۹،۲۰،۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔اس اثناء میں شیخ الہند رہا ہو چکے تھے اور انہوں نے ہی اس کی صدارت فرمائی تھی۔اس اجلاس میں ملک کے طول وعرض سے پانچ سو سے زائد علماء کرام شریک ہوئے،جن میں مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا ثناء اللہ امرتسری،مولانا شبیر احمد عثمانی،مولانا محمد فاخر الہ آبادی،مولانا عبداللہ الکافی،مولانا حبیب الرحمٰن،مولانا ابو القاسم سیف بنارسی،مولانا عبد الحلیم صدیقی،مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی،مولانا عبدالماجد بدایونی،مولانا محمد جونا گڑھی،مولانا سید محمد داؤد غزنوی،مولانا عبداللہ الباقی،حکیم حافظ محمد اجمل خاں،مولانا مفتی کفایت اللہ،مولانا احمد سعید دہلوی،مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری،مولانا محمد اکرم خان،مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب قصوری شامل تھے۔

امرتسر کے اجلاس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری،مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا آزاد سبحانی کی تحریک وتائید سے انگریزی حکومت کے خلاف نہایت زوردار قراردادیں منظور کی گئیں،جن میں انگریز سے کلی طور پر ترک موالات اور عدم تعاون کی مشہور ومعروف اور معرکہ آرا قراردادیں شامل ہیں۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ اس کاروان علماء کے بنیادی محرک علماء اہل حدیث بالخصوص شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے، جو اس کے دائرہ کی مزید وسعت کے قائل تھے، جمعیت علماء ہند حقیقت میں علماء اہل حدیث اور علماء احناف کے مشترکہ عمل، جد وجہد اور کوششوں سے ہی تاریخ ساز بنی۔

تحریک وتجویز سے لے کر تاسیس وقیام اور اس کے تناور درخت ہونے تک ہر موڑ پر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبداللہ الکافی، سید محمد فاخر الہٰ آبادی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبدالغفار غزنوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا ابوتراب عبدالحق امرتسری، مولانا عبدالوہاب آروی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب جیسے نابغۂ روزگار علماء اہل حدیث اس کارواں کے سپہ سالاروں میں شامل رہے۔تقسیم وطن کے بعد ستر کے دہے میں

استاد الاساتذہ علامہ عبدالوہاب آروی کی صدارت تک حضرت مولانا عبدالوہاب آروی، مفکر ملت مولانا عبدالجلیل رحمانی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا محمد داؤد راز، حاجی محمد صالح آف کوٹھی حاجی علی جان دہلی، خواجہ محمد سلیم اور مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے اجلہ علماء اہل حدیث اس کے سرخیل تھے۔ حضرت مولانا عبدالوہاب آروی بیک وقت آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس (مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند) اور جمعیت علماء ہند کے صدر رہے۔ برسہا برس مولانا فارقلیط اور جناب محمد سلیمان صابر جمعیت کے آرگن وترجمان ''المعیۃ'' کو اپنے رشحات قلم سے بیدار کرتے رہے۔ مگر افسوس تاریخ نگاری کی بجائے تاریخ سازی کے دور کوتاہ بین میں پہلے اس ملی عظمت کے مشترکہ پلیٹ فارم کو ایک مخصوص مکتب فکر سے منسوب کیا گیا، پھر ایک خاندان میں مقید بنانے کی کوشش رہی اور اب ایک گھرانے میں سمیٹا جا رہا ہے۔

حقائق، شواہد اور دلائل کو بدلا تو جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا "تلك الأيام نداولها" ایک غیر منسوخ قرآنی حقیقت ہے، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، ہمیں کوئی گلہ نہیں لیکن افسوس ہے یہ تاریخ ساز جماعت جب سے اپنے تاسیسی اصول وضوابط اور مؤسسین کے طرز فکر سے ہٹی تو بحرانوں کا شکار ہوئی اور اب یہ تاریخ سوز بنتی جا رہی ہے۔ فهل من مدكر؟

جمعیت کے موجودہ بحران کے اسباب وعوامل کچھ بھی ہوں وہ پوری ملت کے لیے تکلیف دہ اور امتحان وآزمائش سے کم نہیں، بہی خواہوں کو اس کے اصل محرکات کا پتہ چلانے اور اسلاف کے ایک عظیم ورثہ کے دائمی تحفظ کی فکر کرنی چاہئے۔

مولانا محمود مدنی کا تعلق نئی نسل سے ہے وہ فہم وفکر میں بھی وسعت رکھتے ہیں، اعتدال ورواداری اور یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ بھی ان میں موجود ہے، ان کے ساتھ میرے چند سوابق کے پیش نظر مجھے یہ کہنے میں عار نہیں ستر ونوے کے دھے کے درمیان جمعیت کے یگانہ ویک زاویہ سوچ سے اٹھ کر ان کے اندر چلنے کی صلاحیت ہے ایک نوجوان قائد کی حیثیت سے اور حضرت مولانا سید محمد ارشد مدنی وفقہ اللہ جو دارالعلوم دیوبند جیسی عالمی درسگاہ کے مربی وشیخ والحدیث ہیں کی موجودگی میں جمعیت علماء کا انتشار ہر اس شخص کے لئے باعث گریہ وزاری ہے جس کا خواہ براہ راست جمعیت سے تعلق ہے یا وہ مؤسسین کے قافلہ کا فرد ہیں۔

جمعیت کے دائمی اتحاد کے لیے اسے فکری، گروہی، خاندانی اور گھریلو حد بندیوں کے انحصار سے نکال ان ستونوں پر کھڑا کرنے کی ضرورت ہے جس پر حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سعید احمد دہلوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی جیسے عظماء نے قائم کیا تھا اور جس ڈگر پر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب چلاتے رہے۔

کیا افراد امت اور امت کے مخلص حضرات تین دہوں میں تین سے زائد بار انتشار وتقسیم کے عوامل اور آئندہ کے لیے اس کے سدباب کی فکر کریں گے؟

☆☆☆

۱۸۵۷ء اور وہابی تحریک

(۲-۲)

مولانا محمد ابوالقاسم سلفی فاروقی
استاذ جامعہ رحمانیہ، بنارس

وہابی تحریک کے چند امتیازی پہلو

وہابی تحریک کے دو خاص نصب العین تھے پہلا اصلاحی اور دوسرا سیاسی تھا، اسلام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت مسلمہ کا سب سے اہم فریضہ ہے، سید احمد اور مولانا اسماعیل نے سب سے پہلے اسی فریضہ کی ادائیگی کا بیڑہ اٹھایا، چنانچہ آپ کی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں میں اوہام پرستی، قبر پرستی اور بدعات وخرافات کے خلاف احساس جاگا، فقہی موشگافیوں پر اتباع سنت اور عمل بالحدیث کا جذبہ غالب ہوا، نکاح بیوگان کی سنت کا احیا ہوا، سید صاحب میدان جنگ میں بھی اس فریضہ کو نہیں بھولتے تھے، آپ نے تبلیغ کا پورا نظام قائم کیا، آپ کی وفات کے بعد تبلیغی نظام پورے نظم وضبط کے ساتھ قائم رہا، وہابی تحریک کی تبلیغی جدوجہد کے اثرات آج بھی پورے ہندوستان میں دیکھے جاسکتے ہیں، سیاسی مقصد کے حصول کے لئے آپ نے روح جہاد کو زندہ کیا، آپ نے جہاد کا جذبہ اس طرح بیدار کیا کہ ہر پکے وسچے مسلمان کی دلی تمنا یہی بن گئی کہ وہ میدان جنگ میں شہادت حاصل کرے۔

اس تحریک کو مسلمان اور ہندوؤں دونوں کا تعاون حاصل تھا، ظاہر ہے اتنی بڑی حکومت کے خلاف ایسی زبردست تحریک عوامی مدد کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی تھی، ترسیل زر کا ایک اہم ذریعہ ہندو ساہوکار تھے جو یقینی طور پر وہابی تحریک کے خطرناک مقصد کے بارے میں واقف تھے، وہابی تحریک کے جلسوں اور چندوں کی فراہمی میں ہندو بھی حصہ لیتے تھے، چنانچہ دیہاتسیک نے بمبئی کے ایک جلسے کے واقعے پر تعجب کا اظہار کیا جس میں وہابی مقرر کے سامعین میں زیادہ تر ہندو تھے اور مقرر نے عیسائی مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔(۱) وہابی تحریک کے سیاسی پہلو میں ہندوستانی عوام کے لئے بڑی کشش تھی، سیاسی پہلو ہی کی بنا پر وہ مجاہدین کو نجات دہندہ سمجھتے تھے اور دل کھول کر ان کی مدد کرتے تھے، وہ وہابی تحریک کے رازوں کے امین تھے اور اس کا افشا کرنا وطن کے ساتھ غداری سمجھتے تھے، نتیجۃً وہابی تحریک اپنے مخصوص دائرے سے نکل کر ایک

(۱) ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۵۰۔

قومی اورعوامی تحریک بن گئی۔

وہابی تحریک نے اردو ادب کو ایک عظیم نثری سرمایہ فراہم کیا، اردو نثر نگاری کے ارتقا میں وہابی تحریک نے اہم رول ادا کیا، وہابی تحریک کے مخاطب عوام تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ تر اردو میں ہیں، وہابی تحریک کے ادبی سرمایہ کو وہابی ادب کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا آغاز شاہ ولی اللہ کے فرزندوں کے تراجم قرآن سے ہوا، مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان کے اتنے ایڈیشن نکلے کہ پورے ہندوستان میں کوئی کتاب آج تک اس کا مقابلہ نہیں کرسکی، اردو ادب کے مورخین میں خصوصا رام بابوسکسینہ (تاریخ ادب اردو) پروفیسر حامد حسن قادری، اختر اورینوی (اردو ادب میں بہار کا حصہ) اور خواجہ احمد فاروقی وغیرہ نے وہابی تحریک کی ادبی خدمات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

وہابی تحریک کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلکی تعصب، تحزب اور تشدد سے پاک تھی، تحریک کے رہنما خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتہ تھے، جن کا مقصد امت مسلمہ کو دینی اساس پر متحد کرنا اور فرنگی حکومت کو ختم کرنا تھا، تحریک میں مسلکی تفریق کو ہوا دینے والے افراد کی کوئی گنجائش نہیں تھی، سید صاحب فروعی مسائل میں حنفی مسلک پر عمل کرتے تھے، لیکن آپ کے دست راست مولانا اسماعیل شہید عامل بالحدیث اور تقلیدی بندشوں سے آزاد تھے، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور تمام علماء صادق پور عامل بالحدیث تھے، ان میں مسلک کو لے کر آپس میں کبھی کوئی کشمکش نہیں ہوئی، اور نہ اختلاف، بحث اور مناظرہ ہوا، وہابی مبلغین خاص طور سے اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ اگر کبھی معاشرہ میں کسی متشدد عالم سے ٹکراؤ کا موقع آتا تو مباحثہ اور مناظرہ کے بجائے قرآن اور سنت سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے اور اگر وہ ضد سے کام لیتا تو دامن جھاڑ کر آگے بڑھ جاتے۔ تحریک کے تمام کارکنان اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے، کیونکہ ان کے امام سید احمد شہید کی یہی تعلیم تھی، چنانچہ ''صراط مستقیم'' جو سید صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور جسے شاہ اسماعیل شہید نے ترتیب دیا اور خود سید صاحب نے اس میں قطع و برید اور نظر ثانی کی، اس کا ایک اقتباس قابل دید ہے: ''در اتباع مذاہب اربعہ کہ رائج در تمام اہل اسلام است بہتر وخوب است لیکن علم پیغمبر ﷺ را منحصر در علم یک شخص از مجتہدین نداند بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گردیدہ بموجب مقتضیات وقت بہر کس رسیدہ وبعد ازاں کتب مصنف شدہ جمعیت آں علوم ظاہر گشتہ پس در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح صریح غیر منسوخ یابد اتباع ہیچ مجتہد دراں نہ کند واہل حدیث را مقتدائے خود شناسد وبہ دل صحبت ایشاں دارد وتعظیم ایشاں لازم شمرد کہ حاملان علم پیغمبر اند وبہ نوع مصاحبت پیغمبر ﷺ حاصل کردہ مقبول جناب رسالت مآب گشتہ اند''۔(۱) یعنی ''مذاہب اربعہ کی عموما رائج، اتباع ٹھیک ہے، لیکن علم نبوی کو ایک مجتہد میں منحصر نہ سمجھا جائے، اس لئے کہ ہر مجتہد کو وقت کی ضرورت کے مطابق اس میں سے حصہ

(۱) شاہ اسماعیل شہید: مرتب صراط مستقیم ص ۶۹۔

مل گیا، بعدازاں جب کتب حدیث وجود میں آئیں تو علم پیغمبر ﷺ ان میں جمع ہوگیا، بنابریں جس مسئلے میں بھی حدیث صحیح وصریح وغیر منسوخ مل جائے تو اس کے خلاف کسی مجتہد کی اتباع نہ کی جائے، اس بارے میں اہل حدیث کو مقتدی ماننا چاہئے، ان سے محبت اوران کی تعظیم ضروری ہے، علم نبوی کے وہی حامل ہیں، جن کو ایک قسم کی صحبت نبوی کے باعث آں حضرت ﷺ کے ہاں مقبولیت حاصل ہے۔''

سید صاحب کی اس فکر کی مزید وضاحت شاہ اسماعیل شہید اور مولانا ولایت علی کی تصانیف میں ملتی ہے، ۱۸۳۱ء کے بعد تحریک کی قیادت مکمل طور سے اہل حدیثوں کے ہاتھ میں آگئی لیکن وہ اپنے مرشد کے متعین کئے ہوئے منہج پر ہی چلتے رہے اورانہوں نے مسلکی تحزب اور تشدد کو تحریک میں تداخل کا کوئی موقع نہیں دیا۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کی فضا بالکل بدل گئی، مسلکی تعصب نے اپنے ہاتھ پیر باہر نکالے۔ ایک طرف انگریزوں نے وہابی تحریک کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا، برٹش حکومت نے اپنے وفادار مولویوں سے وہابی تحریک کے خلاف باقاعدہ فتاوے شائع کروائے، چنانچہ کلکتہ کے مولوی عبداللطیف اور مولوی کرامت علی جو پہلے وہابی تحریک کے سرگرم رکن تھے، لیکن ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی وفاداری تبدیل کرلی، ان دونوں نے فتوی دیا کہ برٹش حکومت کے خلاف جہاد کرنا ناجائز ہے(۱)، دوسری طرف ولیم ہنٹر نے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' لکھ کر فرقہ واریت کی ایسی فضا قائم کی کہ ہندوستانی دو الگ دھاروں میں بٹ گئے، اس طرح وہابی تحریک کی مخالفت کی باقاعدہ لہر چل پڑی، شمالی ہندوستان کے علماء بھی پیچھے نہ رہے اور انہوں نے مولوی عبدالحی کی قیادت میں برٹش حکومت کے مقبوضہ ہندوستان کو دارالسلام بنادیا، بیسویں صدی کے مورخین تو ہنٹر سے بھی آگے بڑھ گئے، کسی نے تحریک کو اس انداز سے پیش کیا جیسے دو مذہبی گروہ باہم دست وگریباں ہوں، بعض مصنفین نے اپنے افکار وخیالات کے سانچے میں وہابی تحریک کو ڈھالنے کے لئے اپنی پوری توانائی صرف کردی، کسی نے تحریک کے سیاسی پہلو کو لائق اعتنا نہ سمجھا، کچھ لوگوں نے ایسا غضب ڈھایا کہ تحریک کے خدوخال ہی کو مسخ کرنے پر تل گئے، انہوں نے واقعات، حقائق اور دستاویزی شواہد کو پرے پھینک دیا اور وہابی تحریک کی ایک جدید تاریخ رقم کردی، بہرحال اہل علم اور سنجیدہ مؤرخین کی نظروں سے یہ چیزیں چھپ نہ سکیں اور پوری تحریک خصوصا اس کے سیاسی پہلو کو انہوں نے منظر عام پر لانے کی پوری کوشش کی، اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر قیام الدین احمد کی کاوشیں یقیناً قابل تحسین ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہابی تحریک کا کردار

گزشتہ سطور میں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ وہابیوں ہی کا کارنامہ تھا کہ ملک کی مختلف چھاؤنیوں میں ہندوستانی سپاہ

(۱) ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۲۷۔

برگشتہ ہوئی اور انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھالیا، یہ وہابیوں ہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے پورے ملک میں گھوم گھوم کر ہندوستانی عوام کو بغاوت کے لئے تیار کیا، اس کے باوجود بہت سے مورخین یہ ماننے کے لئے تیارنہیں ہیں کہ جنگ آزادی میں وہابیوں کی شمولیت تھی، چنانچہ ڈاکٹر ڈی این سین اور ڈاکٹر آرسی مجمدار کی رائے ہے کہ ''وہابیوں نے من حیث الجماعۃ اس بغاوت کا ساتھ نہیں دیا''۔(۱) اسی رائے کی موافقت کرتے وہابی تحریک کے ہم درد مصنف مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:'' اسی دوران ۱۸۵۷ء کا پرآشوب حادثہ پیش آیا اور گومجاہدین اوران کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے پھر بھی پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر نے مولانا احمد اللہ صادق پوری وغیرہ کو بہت دق کیا''۔(۲)

یہ درست ہے کہ بعض مراکز میں وہابی تحریک کے کارکن خاموش رہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہابی تحریک کے دومحور تھے، پہلا سرحدی علاقہ جہاں سے مسلسل وہ انگریزوں کونقصان پہنچارہے تھے، دوسرا اندرون ملک کا مرکز جس کے ذمہ سرمایہ اور افراد کی فراہمی تھی اگر اندرون ملک مرکز محاربہ کا آغاز کردیتا تو یہ تحریک بھی پوری طرح ۱۸۵۷ء ہی میں کچل دی جاتی، یہ وہابی رہنماؤں کی سیاسی بصیرت تھی، جس نے وہابی تحریک کی زندگی کو دراز کردیا، لیکن یہ بھی ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ وہابیوں نے انفرادی طور پر قومی آزادی کی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا، جنگ آزادی کا مقصد فرنگیوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکالنا تھا اور وہابی تحریک مسلسل چالیس سال سے اسی مقصد کے لئے جدوجہد کررہی تھی، مقصد میں اشتراک ہی کی وجہ سے وہابی تحریک سے وابستہ علما اور عوام اپنے اپنے علاقوں میں انگریزوں سے معرکہ آرائی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے وہ انگریزوں سے مورچہ لینے میں پیش پیش رہے، گولیوں کا نشانہ بنے، تختہ دار پر چڑھے اور عبور دریائے شور کی سزائیں بھگتیں، ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے جنگ آزادی میں قیادت کا علم اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنے جنگی تجربات کے ذریعہ انگریزوں کا ناطقہ تنگ کردیا، ان میں ایسے لوگ بھی تھے تاریخ جن کے صرف ناموں سے واقف ہے اور کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے نام تک سے ہم ناواقف ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی جنگ آزادی میں وہابی مجاہدین کی شرکت کے بارے میں رقم طراز ہیں:''چنانچہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملا حصہ لینے والے بہت سے افراد سید احمد شہید کے افکار ونظریات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، بخت خاں کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی جماعت مجاہدین ہی سے متعلق تھے، بہادر شاہ کے مقدمہ کے دوران ان کو وہابی العقیدہ بتلایا گیا، کوئی شخص جس نے ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' پڑھی ہے، اس سے انکارنہیں کرے گا کہ وہابی کا لفظ اس زمانے میں سید صاحب اوران کے ہم خیال علما کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور بقول ہنٹر ''وہابی اور غدار'' ہم معنی لفظ تھے، بخت خاں نے علماء سے جس نوع کے تعلقات رکھے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید صاحب کی تحریک

(۱) ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۲۶۰۔ (۲) مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۸۰۔

سے متاثر تھے، جس وقت وہ تحریک میں حصہ لینے کے لئے دلی پہنچے سوعلما ان کے ہمراہ تھے، دوران ہنگامہ وہابی علما کی ایک جماعت ٹونک سے ان کے پاس آئی تھی، اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار اور آگرہ سے بھی کافی علما کھینچ کھینچ کر ان کے گرد جمع ہوگئے تھے، مولانا لیاقت علی الہ آبادی بھی اسی مکتب خیال کے مجاہد معلوم ہوتے ہیں، مولانا عنایت علی جن کی کوششوں سے مروان میں رجمنٹ نے بغاوت کی تھی سید صاحب کے خلیفہ اور جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے، مولانا عبدالجلیل شہید علی گڈھی جنہوں نے فرنگی قوت سے دلیرانہ مقابلہ کیا سید صاحب کے خلفا میں سے تھے، ان چیدہ شخصیتوں کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حصہ لینے والے بہت سے اشخاص سید صاحب کی جماعت یا ان کے مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے اور غالباً اسی بنا پر بعض لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو مسلمانوں کی تحریک قرار دیا تھا''۔(۱) اسی صفحہ کے حاشیہ پر پروفیسر مجمد ارکی یہ رائے کہ ''۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں نے حصہ نہیں لیا'' کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:'' تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ وہابی اس تحریک میں پیش پیش تھے، محض یہ بات کہ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم ہوجانے کے بعد وہابیوں کو سخت سزائیں دی تھیں اور اس مکتب خیال کے لوگوں کو پسپا کیا تھا تحریک میں ان کا حصہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں''۔(۲)

بخت خاں کے وہابی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے وہ مولوی سرفراز علی سے بیعت تھے جو سید صاحب کے مریدین میں تھے، خود مولوی سرفراز علی نے ۱۸۵۷ء میں قائدانہ رول ادا کیا تھا، دہلی کے مشہور فتوی پر ان کے دستخط موجود ہیں وہ ہر محاذ پر بخت خاں کے ساتھ نظر آئے، سقوط دہلی کے بعد بخت خاں کے ہمراہ وہ بھی نیپال چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔(۳) مولوی قطب شاہ بریلوی کا تعلق بھی وہابی تحریک سے تھا، آپ ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہد تھے پہلے آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی بعد میں حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہوگئی۔(۴) مولانا لیاقت علی وہابی تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔۱۸۵۷ء میں آپ نے عوام کو انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے مشہور اہل حدیث عالم مولانا خرم علی بلہوری کی مثنوی جہادیہ سے بڑا کام لیا، یہ وہی مثنوی ہے جسے سرحد پر جنگوں میں مجاہدین پڑھ کر فوج میں جوش پیدا کرتے تھے۔ پارسن نامی ایک انگریز افسر نے پشاور کے کلکٹر کے نام ایک خفیہ مکتوب میں ذکر کیا ہے کہ: اس (مولوی لیاقت علی) کا تعلق سرحد کے مولویوں سے ہے یا فیروز شاہ سے ہے اور دوبار سرحد جاچکا ہے۔(۵) ڈاکٹر اقبال حسین نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا کہ نیشنل ہیرالڈ کی یکم ستمبر ۱۹۵۸ء کی ایک خصوصی رپورٹ کے مطابق ان کی ایک تصویر امیر افغانستان کے ساتھ پشاور کے میوزیم میں موجود ہے۔(۶) تصویر میں امیر افغانستان کے ساتھ مولوی صاحب کا ہونا واضح ثبوت ہے کہ سرحد سے ان کا کافی گہرا تعلق تھا۔

(۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۵۔ (۲) ایضاً ص ۱۵۔

(۳) پروفیسر عابد سمیع الدین، قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان ص ۱۲۲۔ (۴) ایضاً ص ۳۸۹۔ (۵) ایضاً ص ۳۸۹)

(۶) ڈاکٹر محمد اقبال حسین ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا مضمون: مولوی محمد لیاقت علی الہ آبادی، سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڈھ، اپریل تا جون ۱۹۸۷ء۔

مولانا نذیر احمد صاحب املوی نے ''اہل حدیث اور سیاست'' میں مولانا ابوالخیر فاروقی (م ۱۹۸۰م) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولوی لیاقت علی کے نواسے قاضی محمد ایوب صاحب جوعقیدۃً پختہ اہل حدیث ہیں انہوں نے اپنے نانا کے بارے میں وثوق سے بتلایا کہ وہ قطعی اہل حدیث تھے اور سنت نبی کے عاشق تھے۔(۱)

شہزادہ فیروز شاہ جو شاہ عالم ثانی کے پوتے اور شاہ فرخ کے نواسے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ میں زبردست قیادت کی اور مختلف محاذ پر انگریزوں سے لڑے، فیروز شاہ کا تعلق بھی وہابی تحریک سے تھا، فیروز شاہ ۱۸۵۹ء میں تانتیا ٹوپے سے الگ ہو کر کابل پہنچے، ۱۸۶۸ء میں وہ سرحدی مجاہدین کے پاس موجود رہے، چنانچہ دہلی میں وہابی تحریک کے کارکن امید علی نے گرفتاری کے بعد خلاصہ کیا کہ ان کی موجودگی میں کچھ لوگ محمد امین کے پاس آئے، پتہ چلا کہ وہ شہزادہ فیروز شاہ کے پاس سے آئے ہیں جو سرحد پر رہتے ہیں وہ فیروز شاہ کی طرف سے دکن کے بعض راجاؤں کے نام خط لائے ہیں، یہ خط فیروز شاہ کے بھائی شاہزادہ ایزو بخش کو پہنچانا تھا جو دہلی کی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور کپڑے کی دکان کرتا تھا، ایزو بخش مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ان سے ملا، امید علی کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہزادہ فیروز شاہ ابھی ناامید نہیں تھے، اور انہوں نے دکن کے بعض راجاؤں کو دریائے آکسس پر ملنے کی دعوت دی۔(۲)

۱۸۵۷ء کی ایک بڑی شخصیت شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی کی ہے جنہیں شاہ محمد اسحاق نے مکہ ہجرت کرتے وقت اپنا علمی جانشین بنایا تھا، آپ کی شہرت ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں تھی، ۱۸۵۷ء میں آپ دہلی میں وہابی کارکنوں کے صدر تھے، اور سرحد پر رنگروٹ بھیجنے کی ذمہ داری آپ کی تھی، بخت خاں کے فتوی جہاد میں آپ کا نام سرفہرست ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد وہابیوں کے خلاف جو تحقیقات کی گئیں ان میں میاں صاحب کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے، یہ تائید غیبی تھی کہ احتیاطی طور پر چھ ماہ کی جیل کے بعد آپ رہا کردیئے گئے۔(۳)

بنارس کے مولانا جلال الدین جعفری کا ذکر مفتی انتظام اللہ شہابی نے کیا ہے کہ آپ شاہ اسماعیل شہید کے شاگرد تھے اور ۱۸۵۷ء میں زبردست حصہ لیا، لیکن گرفتاری سے محفوظ رہے، اہل صادق پور میں الٰہی بخش جو مولانا ولایت علی کے خسر تھے اور مولانا کے ہاتھ پر بیعت تھے انہیں پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے ۱۸۵۷ء میں وہابیوں کا سردار بتلایا، مولانا احمد اللہ صادق پوری کو ۱۸۵۷ء میں احتیاطی طور پر گرفتار کیا گیا، دوبارہ ۱۸۶۵ء میں ان پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا اور کالا پانی کی سزا دی گئی، وہیں ۱۸۸۱ء میں بڑی کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہوا، ۱۸۶۴ء میں انبالہ میں وہابی تحریک کے گیارہ ممبران پر بغاوت کا مقدمہ چلا، یہ

(۱) مولانا نذیر احمد رحمانی: اہل حدیث اور سیاست ص ۱۸۵۔

(۲) ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک ص ۳۱۴۔ (۳) ایضاص ۳۱۵۔

مقدمہ ''وہابی اسٹیٹ ٹرائل'' کے نام سے مشہور ہے، مولانا یحییٰ علی برادر مولانا احمد اللہ، مولانا جعفر تھانیسری اور محمد شفیع کو سزائے موت دی گئی اور بقیہ افراد کو عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی، محمد شفیع سرکاری گواہ بن کر دو سال بعد رہا ہو گیا، بقیہ دونوں افراد کی سزا بعد میں حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی، مولانا یحییٰ علی کا جزیرہ انڈمان میں ۱۸۶۸ء میں انتقال ہو گیا، لیکن مولانا عبدالرحیم، مولانا جعفر تھانیسری اور امیر الدین وغیرہ اپنی سزا کاٹ کر وطن واپس آئے۔

یہاں ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے والے وہابی مجاہدین کا استقصا مقصود نہیں بلکہ مشتے نمونہ ازخروارے چند مجاہدین کا ذکر تھا جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں براہ راست حصہ لیا اور تاریخ میں اپنا نام ثبت کرالیا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جن جن علاقوں میں لڑی گئی، وہابی تحریک سے وابستہ بے شمار مجاہدین نے ان علاقوں کی پیاسی زمینوں کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دیا، ان کی کہانیاں زمین کی تہوں میں انہیں کے ساتھ دفن ہو گئیں، یا ان کی حکایت خوں چکاں منتشر اوراق میں بکھر گئیں۔

دیانت دار، غیر جانب دار اور منصف مزاج مورخین اور مصنفین میں سے چند کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں انہوں نے وہابیوں کی داستان سرفروشی کو کس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ وہابی تحریک کے سیاسی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ان اسباب سے اس زمانے میں گورنمنٹ جس کسی پر وہابی ہونے کا شبہ ہو جاتا فوراً گرفتار کر لیتی، مقدمہ چلاتی، پھانسی ورنہ کم از کم کالے پانی یا حبس دوام کی سزا دیتی، چنانچہ اس جماعت کے سیکڑوں علماء، امراء، تاجر کالے پانی بھیجے جا چکے تھے صرف یہی نہیں بلکہ جن پر مقدمہ چلائے جاتے تھے، ان کے تمام اہل وعیال بھی تباہ ہو جاتے تھے کیونکہ یا تو وہ بھی گرفتار ہوتے تھے ورنہ جائداد کی ضبطی کی وجہ سے خود بخود تباہ ہو جاتے تھے، چنانچہ مشہور وہابیان بنگالہ اور خاندان صادق پور کے نتائج یہی ہوئے، اس طرح کلکتہ کے مشہور تاجران چرم امیر خاں اور حشمت خاں کے خاندان بھی برباد ہوئے''۔(۱)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی (م ۱۹۸۵ء) اپنے ماہنامہ برہان میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے علما بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان علماء کرام کی آرا اس لئے اور بھی لائق توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت سید احمد شہید کے زیر قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا، اور اسی بناء پر انگریز انہیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے''۔(۲)

مولانا سید سلیمان ندوی تراجم علماء حدیث کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں: ''اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ جہاد جس کی آگ اسلام کی مجمر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی یہاں تک کہ ایک زمانہ گذر گیا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ

(۱) مولانا آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۸۴، ۹۵۔ (۲) ماہنامہ برہان دہلی اگست ۱۹۶۶ء ص ۵، مضمون: ہندوستان کی شرعی حیثیت۔

سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہوئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پا بجولاں دریائے شور عبور کر دیئے گئے یا تنگ کوٹھریوں میں انہیں بند ہونا پڑا اور اب پردہ کیسا صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۹۱۸ء) کی زندگی تک اس تحریک کے علمبرداران میں یہ روح کام کر رہی تھی، اس تحریک کی بنیاد تین چیزوں پر تھی: (۱) نصب امارت (۲) زکوۃ کی مرکزیت (۳) اسلام سے تمام بیرونی اثرات کو مٹا کر اس کو پھر سے اصلیت کی طرف لوٹانا۔'' (۱)

مشہور مجاہد آزادی اور صحافی ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر جناب آغا شورش کاشمیری نے لاہور میں اہل حدیث کانفرنس کے عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جماعت اہل حدیث کے متعلق فرمایا: ''۱۸۵۷ء میں جب دہلی مرحوم ہوگئی، مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنت نکل گئی اور ان کے لئے ہندوستان کا طول وعرض تنگ ہوگیا تو جس جماعت کو انگریزی استعمار کے چولہے کا ایندھن بننا پڑا، پھر علما پر جو مقدمات قائم کئے گئے اور یہ سلسلہ دار وگیر انیسویں صدی کی آخری آٹھ اور نو دہائیوں تک چلتا رہا تو جن لوگوں نے ہندوستان کے مقتل میں جان دی ان میں پونے دو لاکھ افراد تھے جن کا اپنا نام تو اس قتل عام کی زود فراموشی کے باعث محفوظ نہیں رہ سکا، لیکن ان کی جماعت کا نام رہ گیا ہے، اب جو ریکارڈ سامنے آرہا ہے اس سے ان کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے خون پر جو چھاپ لگا گئی تھی وہ ان کے وہابی ہونے کی تھی...... یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سب سے بڑی مصلح جماعت اور اس کے غیرت مند رہنماؤں کو برطانوی استیلاء اور بدعتی فضا کی پروردوں نے دشنام واتہام کا ہدف بنا کر اسلام کی طاقت کو کمزور کیا اور اسلام کی حقیقت کو مجروح۔ ورنہ ایک خاص مرحلے سے ایک خاص دور تک ہندوستان میں اسلام کی تاریخ وہابی جماعت ہی کی مرہون منت ہے، میں اہل حدیث کا اس لحاظ سے معترف ہوں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کے گوہر دانہ بھی مسلمان میں موجود رہے ہیں، جنہوں نے دین کو صحیح کیا، لیکن خود رسوا ہوگئے، جنہوں نے اسلام کو بالا کیا، لیکن خود غضب کا شکار ہوگئے، جنہوں نے غیر ملکی استعمار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن اپنوں کے ہاتھوں اور پرایوں کے خنجروں سے گھائل ہوتے رہے''۔ (۲)

کتابیات

۱- مولانا ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید حصہ اول، چھٹا ایڈیشن ۱۹۷۷، ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔
۲- مولانا ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید حصہ دوم، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۷، ناشر: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔
۳- مولانا نذیر احمد املوی: اہل حدیث اور سیاست، طبع دوم: ۱۹۸۶ء، ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء، جامعہ سلفیہ، بنارس۔

(۱) ابو یحیٰ امام خاں نوشہروی: تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۰ طبع اول۔
(۲) ہفت روزہ ''چٹان'' ۱۳ر نومبر ۱۹۶۷ء بحوالہ حافظ صلاح الدین یوسف: تحریک جہاد جماعت اہل حدیث اور علمائے احناف، ص ۱۹، ۲۰۔

۴-ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی: تراجم علمائے حدیث ہند ۱۳۵۷ھ، طبع اول، جید برقی پریس دہلی۔

۵-محمد حمزہ حسنی: تذکرہ سید احمد شہید، طبع اول ۱۹۹۵ء، مکتبہ اسلام لکھنؤ۔

۶-شمیم طارق: غالب اور ہماری تحریک آزادی، باراول ۲۰۰۲ء، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی۔

۷-ڈاکٹر قیام الدین احمد: ہندوستان میں وہابی تحریک، مترجم: پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، ۲۰۰۱ء، مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن۔

۸-ڈاکٹر تاراچند: تاریخ تحریک آزادی ہند جلد دوم مترجم غلام ربانی تاباں، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۱ء، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی

۹-سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی: ۱۸۵۷ کے چشم دید حالات المعروف داستان غدر، ۲۰۰۶ء، اریب پبلیکیشنز نئی دہلی۔

۱۰-پروفیسر مسز عابدہ سمیع الدین: قومی محاذ آزادی اور یوپی کے مسلمان، ۲۰۰۴ء، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی۔

۱۱-خلیق احمد نظامی: (مرتبہ) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ۱۹۵۸ء، ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی۔

۱۲-فیصل احمد بھٹکلی ندوی: تحریک آزادی میں علما کا کردار (۱۸۵۷ء سے پہلے) ۲۰۰۳ء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔

۱۳-نواب صدیق حسن خاں بھوپالی: ترجمان وہابیہ، ۱۳۱۵ھ، سعید المطابع دارانگر، بنارس۔

۱۴-شیخ حسام الدین ترجمہ انقلاب ۱۸۵۷ء تصویر کا دوسرا رخ، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۲ء، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔

۱۵-حافظ صلاح الدین یوسف: تحریک جہاد جماعت اہل حدیث اور علمائے احناف، طبع اول ۲۰۰۰ء، دار الکتب الاسلامیۃ جامع مسجد دہلی۔

۱۶-مولانا غلام رسول مہر: سید احمد شہید، علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱ء طبع سوم، لاہور۔

۱۷-مولانا غلام رسول مہر: جماعت مجاہدین، غلام علی اینڈ سنز لاہور۔

۱۸-سوونیر: مجاہدین صادق پور (ہند) پٹنہ بہار نمبر، اپریل ۱۹۹۸ء، امارت اہل حدیث صادق پور ہند پٹنہ بہار۔

۱۹-مفتی انتظام اللہ شہابی: غدر کے چند علما۔

۲۰-ڈاکٹر اقبال حسین: مضمون: مولوی محمد لیاقت علی الہ آبادی، سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اپریل-جون ۱۹۸۷ء۔

۲۱-جنگ آزادی کے روشن چراغ، روزنامہ راشٹریہ سہارا، آزادی نمبر ۱۵/اگست ۲۰۰۶ء، نئی دہلی سنتوش کمار تیواری۔

۲۲-قاضی نسیم احمد: ایولیشنری مولوی لیاقت علی ۱۸۵۷ء مرتب: اے کے سنہا، پیش کردہ: ریسرچ اسکالر شعبۂ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی۔

۲۳-میاں محمد شفیع: ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی واقعات وحقائق ۲۰۰۵ء، اریب پبلی کیشنز نئی دہلی۔

۲۴-پی سی جوشی: انقلاب ۱۸۵۷ء، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۳ء۔

۲۵-مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ ۱۹۹۴ء، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

۲۶-ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم: ڈاکٹر صادق حسین ۲۰۰۲ء، الکتاب انٹرنیشنل جامعہ نگر نئی دہلی۔

۲۷-مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی: (مرتب) صراط مستقیم، باردوم ۱۳۲۲ھ، مطبع مجتبائی دہلی۔

۲۸-محمد بن سعد الشويعر : تصحيح خطأ تاريخي حول الوهابية ، الطبعة الثالثة ١٤١٩ ﻫ ، وزارة التعليم العالى ، الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة ، المملكة العربية السعودية۔

☆☆☆

سمیہ میہان کا قبول اسلام

محمد ثناء اللہ عمری (ایم،اے عثمانیہ)

سمیہ میہان فوجداری قانون کی گریجویٹ ہے، دس بارہ برس پہلے مسلمان ہوئی، وہ مسلمان بچوں کے لئے ایک کتاب لکھ رہی ہے، شوہر اور تین بچوں کے ساتھ کویت میں رہتی ہے، اس نے اپنے قبول اسلام کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ دسمبر ۱۹۹۲ء کا پہلا ہفتہ تھا، میں کالج میں دوسرے سال کی طالبہ تھی اور ششماہی امتحان ابھی چند ہی دن پہلے دے چکی تھی، میں خوش تھی کہ کرسمس کی تعطیل بس دو ہی چار دن میں شروع ہونے والی ہے، وقت بس اتنا ہی رہ گیا تھا کہ میں اپنا ساز وسامان باندھ لوں اور سرمائی تعطیل میں گھر جانے کی تیاری پوری کرلوں، میں نے اپنی ہم حجرہ دوست کے لئے کچھ تحفے تحائف بھی خرید رکھے تھے۔

میں اسی تیاری میں تھی کہ اچانک ایک خیال آیا اور میں ٹھنڈی سی ہوگئی، یہ خیال اس سوال کی صوت میں تھا، خدا واقعی مہربان ہے تو اس نے اپنے اکلوتے بیٹے عیسی کو کیوں سولی پر چڑھائے جانے دیا؟ اس ایک سوال نے بہت سے سوالات سامنے لا کھڑے کردیئے، سچ میں بے دم سی ہوگئی، سانس لینی مشکل ہوگئی، دم لینے اور خیالات پر قابو پانے کے لئے مجھے لیٹ جانا پڑا، یہ خیالات ملحدانہ سے تھے، میں نے اپنے ذہن ودماغ میں ایک فہرست سی تیار کی کہ دیکھوں عیسائیت کے بارے میں میں کتنی باتیں جانتی ہوں اور کتنی باتوں پر یقین رکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ میں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی اور جو کچھ جانتی ہوں اس سے میں مطمئن نہیں ہوں۔

میں بچی ہی تھی کہ ماں باپ نے میرا بپتسمہ کیا اور میرا عیسائی نام رکھا، مگر ماں باپ کچھ زیادہ مذہبی نہیں تھے، رہی چرچ میں حاضری تو وہ کبھی کبھار ہی ہوا کرتی تھی۔ تعطیلات میں البتہ ہم چرچ آتے جاتے تھے، نتیجہ یہ کہ مجھے اپنے دل کے اندر ایک گہرا خلا محسوس ہوا اور میں نے اپنے اندر خدا کو ''محسوس'' نہیں کیا، معا خیال آیا کہ مجھے فوری اقدام کرنا اور خدا کو ''دریافت'' کرلینا چاہئے۔

سرمائی تعطیل ادھر شروع ہوئی اور ادھر ختم بھی ہوگئی، میں کالج واپس گئی کہ گرما کی تعطیل سے پہلے بقیہ نصف تعلیمی سال پورا کرلوں، پھر اپنے ایمان کا انکشاف کرلوں، میں جلد ہی اس کام پر لگ گئی، کالج سے متصل ایک کیتھولک کلیسا میں ایک اتوار کو عبادت کے لئے گئی، عبادت کے دوران میں نے بساط بھر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی، ظاہر ہے کہ عبادت ایک سنجیدہ چیز ہے، ہنسی کھیل نہیں ہے، میں نے چاروں طرف دیکھا، سب کے سب سنجیدہ سی صورتیں بنائے سر جھکائے کھڑے تھے۔

مجھے یہ وعظ مہمل سا لگا، گویا ایک باپ اپنے شریر بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ رہا ہے کہ نیک اطوار بنے، یہ منظر مضحکہ انگیز تھا، دیگر حاضرین اسے چاروناچار سن رہے تھے، کوئی مائی کا لال نہ سوال کر رہا تھا، نہ سچائی کی روشنی کا طالب تھا، مجھے اس دن چرچ میں خدا نہیں ملا، میری تلاش وجستجو جاری رہی۔

پھر کئی برسوں تک معمول یہ رہا کہ میں ہر مسلک کے گرجا گھر جاتی اور حق کی تلاش کرتی رہی، مگر یہاں کے وعظ وبیان بالکل غیر اطمینان بخش نکلے، مبلغوں کے مواعظ بالکل پلے نہیں پڑے۔

یہ وہ وقت تھا کہ دل کا خلا بڑھ رہا تھا، میں گہری افسردگی کا شکار ہوگئی، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے، کیا میں ملحد وزندیق ہوں؟ میں نہیں خیال کرتی تھی کہ ایسا ہو کیونکہ میں ایک ایسی بالاتر مقتدر ہستی کو تسلیم کرتی تھی جو نوع انسانی کی خالق اور حکمراں ہے، کیا میں شیطان کے چنگل میں پھنس گئی ہوں؟ کچھ ایسی ہی بات ہوگی، کیونکہ میں خود اپنے ہی مذہب کا مذاق اڑا رہی تھی، مجھے اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل پا رہے تھے، میری طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہو چلی تھی کہ مجھے اپنی زندگی کا ہر پہلو کھٹکنے لگا تھا۔

یہ حالت تھی، روشنی کا دور دور پتہ نہیں تھا کہ ایک برس بیت گیا، آخر ۱۹۹۳ء تھا کہ اتفاقیہ میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی؟ اس کا نام عابد تھا، میں ہائی اسکول میں اسلام کے بارے میں شدبد جان چکی تھی، تعجب کی بات یہ کہ ہم نے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تاریخ عالم کے مضمون میں کچھ پڑھا تھا، اس کے بوتے پر میں عابد سے اسلام کے بارے میں کچھ بات کر سکی اور اس بھلے مانس نے مجھے اسلام کے بنیادی اصول بتائے۔

میں شروع میں شک کی روگی سی تھی، مسلمانوں کی بابت میں جو کچھ سن چکی تھی وہ تمام تر غلط تھا، میڈیا انہیں برابر دہشت گرد اور عورتوں کے حق میں فرعون بنا کر پیش کرتا، ٹلی ویژن کی ساری باتیں میں بے چوں وچرا مانتی آئی تھی، مزید یہ کہ ان دنوں

میں حقوق نسواں (Feminism) کا مضمون پڑھ پڑھا رہی تھی اور جو کتاب اس کے درس میں تھی اس میں ایک ضخیم باب میں صاف لکھا کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ کتوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں کہ وہ گندی مخلوق ہیں، چنانچہ میں نے عابد میاں سے پہلا سوال جو پوچھا وہ یہ تھا کہ عورتوں کے ساتھ اسلام کیسا سلوک روا رکھتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ خواتین کو مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے، البتہ وہ شرم وحیا کے تقاضوں کے باعث مردانہ سے مل کر نہیں بلکہ الگ رہ کر نماز پڑھیں گی، یہ بات مردانہ اور زنانہ دونوں کے حق میں بہتر ہے، عابد نے مجھے اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیا تھا اور میں اپنی اسلامی معلومات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور سی ہوگئی تھی۔

بدقسمتی کہئے کہ عابد صاحب کو اپنے بیمار باپ کی خدمت کے لئے اپنے ملک کویت لوٹ جانا پڑا، نتیجہ یہ کہ اسلامی معلومات کے حصول کی کوشش میں اکیلی وکیلی رہ گئی، البتہ میں نے عابد سے فون پر ربط رکھا، ہم دونوں نے (فون ہی پر) عیسائیت اور اسلام پر گرما گرم بحثیں کئی ایک کیں، انہوں نے آخر کار چیلنج کے انداز میں کہا کہ ہمت ہو تو باہر نکلو، قرآن مجید کا ایک نسخہ حاصل کرلو اور پڑھو، پھر دیکھو، کیا ہوتا ہے۔ چیلنج سے ڈرنا میری عادت کبھی نہیں تھی، میں اب کی بھی گھبرائی و برائی نہیں، میں نے یہ چیلنج قبول کرلیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے نتیجہ میں میری زندگی ہمیشہ کے لئے بدل کر رہ جائے گی!

قرآن کے انگریزی ترجمہ کے ایک نسخہ کا حاصل کرنا واقعی ایک چیلنج تھا، میں ایک ایسے شہر میں رہتی بستی تھی جس کے گوشے گوشے میں ایک گرجا تھا اور اس کے بازار میں ایک بہت بڑا عیسائی کتاب گھر تھا، یہاں قرآن کا ایک نسخہ ملنا مشکل تھا، میں نے کالج کا کتب خانہ ڈھونڈ ڈالا، خدا خدا کرکے خدا کی کتاب کا ایک نسخہ ہاتھ لگا، یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ یہ کتاب دینیات کے شعبہ میں نہیں بلکہ بچوں کی کتابوں کے حصہ میں رکھی ہوئی تھی، گندی اور بوسیدہ حالت میں پریوں کی کہانیوں کی کتابوں میں پڑی ہوئی تھی، اس پر گرد جمی ہوئی تھی۔

گھر آکر اسے کھولنے سے پہلے مجھے عابد میاں کی سخت ہدایتیں یاد آئیں کہ اسے ہاتھ لگانے سے پہلے پاکی اور صفائی کا اہتمام ہونا چاہئے، یہ بات مجھے بڑی عجیب لگی، ہمارے گھر پر انجیل میز پر رکھی رہتی ہے، اس پر دھول پڑی رہتی ہے، کبھی کبھی ہمارا کتا اسے چاٹ لیتا ہے، ہم چوں تک نہیں کرتے، اس کی قرآن جیسی عزت نہیں ہوتی، بہرحال عابد کی تاکید تھی کہ میں پہلے وضو کرلوں، پھر اسے ہاتھ لگاؤں۔

ایک دن میں نہا دھو کر قرآن ہاتھ میں لے کر بیٹھی اور غیر شعوری طور پر اسے کھولا تو سورۂ احقاف کی یہ آیت سامنے آئی:

﴿ ووصينا الانسان بوالديه احسانا حملته أمه كرها ووضعته كرها ﴾۔ (۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنا۔

میں حیران رہ گئی، کس قدر صداقت پر مبنی بات ہے یہ! میں ورق الٹنے لگی، اور جو کچھ پڑھا اس سے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ طاری ہوگئی، چند دن اور اسی طرح مطالعہ کرنے کے بعد مجھے حیران کن حقائق معلوم ہوئے، قرآن میں موسی، نوح اور عیسی علیہم السلام اور مریم علیہا السلام کا بھی ذکر خیر ہے، اور اس کتاب میں انجیل سے کہیں زیادہ تفصیلات موجود ہیں۔

میں جوں جوں پڑھتی گئی دل خوشی سے معمور ہوتا گیا، محسوس ہوا کہ میں تلاش حق کی صحیح راہ پر گامزن ہوں، مگر میری تلاش حق میں ان باتوں کی وجہ سے خلل پیدا ہوگیا، ایک میرے گھریلو مسائل، دوسرے میری تعلیم، تیسرے یہ کہ میرے رہنما عابد ایک غیر متعینہ مدت کے لئے کویت میں رہنے پر مجبور تھے، مایوسی اور نقصان کے دوہرے احساس نے مجھے آگھیرا، لہذا اسلام سے میری دلچسپی چندے ملتوی سی رہی۔

۱۹۹۵ء تھا کہ فضل الٰہی مجھے دوبارہ اسلام کی طرف لے آیا، میں ابھی بھی عیسائی ہی تھی، تاہم عابد سے میری شادی ہوگئی، شادی کے بعد ہم دونوں کویت منتقل ہوگئے جو میرا اسرالی ملک ہے، ۹۶ء تھا کہ میں نے کلمہ پڑھ لیا، اللہ کے شکر کے آنسو قابو سے باہر ہوگئے، مسجد اندر مسلم بہنیں مجھے گھیرے کھڑی تھیں، میں نے محسوس کیا کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی، اس نے مجھے کفر و انکار کی بے مقصد زندگی اور آلودگی سے بچا لیا، سعودی عرب کی ایک بہن نے ای میل کے ذریعہ مجھے نماز کے طور طریقے سکھائے، فالحمد للہ۔

(انگریزی سے تلخیص)



سوانح

حافظ احمد اللہ مئوی

(متوفی ۱۳۸۰ھ)

ابوعبدالرحمٰن الانصاری
مئوناتھ بھنجن

مئوناتھ بھنجن جومشرقی اترپردیش کاایک مردم خیز، علمی اور صنعتی شہر ہے، پہلے یہ ضلع اعظم گڑھ کا مشرقی حصہ تھا، اسی شہر کے پچھمی حصے میں حافظ صاحب کی ولادت ہوئی، بسیار جستجو کے بعد بھی آپ کی تاریخ ولادت کا تعین نہ ہوسکا، آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد اللہ بن رحم اللہ بن محمد فاضل بن علیم اللہ۔ آپ کے والد رحم اللہ میاں صاحب ڈومن پورہ حبہ کی مسجد کے موذن تھے، ان کی جہرصوتی مشہور تھی۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ آپ نے ایک بنارسی حافظ صاحب کے یہاں- جوآپ کے برادر بزرگ مولانا محمد علی ابوالمحاسن (متوفی ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۰ء وتلمیذ علامہ حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ) کے مکان میں پڑھاتے تھے- لڑکپن میں قرآن شریف حفظ کیا تھا، واضح رہے کہ مذکورہ مکان مدرسہ نما تھا جہاں مولانا مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری رحمہ اللہ (متوفی ۲۰۰۵ء) وغیرہ بھی آپ کے بعد کے دور میں قاعدہ لیکر آیا کرتے تھے، اور یہ مکان حافظ ڈاکٹر مقتدی حسن بن محمد یاسین ازہری صاحب کے آبائی مکان کے سامنے واقع ہے، نیز یہ امر ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ازمنۂ قدیمہ میں جبکہ مدارس ومکاتب کی شدید قلت تھی، اس طرح کی خانگی درسگاہوں کا وجود بلادعربیہ میں بھی تھا، گویاان کی اصل روایات وہیں سے تھیں جہاں علماء بچوں کو لکھنا پڑھنا، قرآن شریف اور حساب وغیرہ کی تعلیم بہت محدود طریقے سے دیا کرتے تھے، ان درسگاہوں کواس وقت کتاتیب کہا جاتا تھا، اس کی مفرد کتّاب ہے۔

آپ ایک جید حافظ اور عالم دین تھے، عربی اور فارسی دونوں زبانوں پرعبور رکھتے تھے، مدرسہ احمدیہ آرہ، مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور اور دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے اکتساب علم کیا تھا، آپ کے شیوخ میں سب سے خاص مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ صاحب تحفۃ الاحوذی تھے، آپ شاعر نہ تھے لیکن بہت عمدہ ادبی وشعری ذوق رکھتے تھے، اخلاق محسنی آپ ہی پڑھاتے تھے، چنانچہ معروف شاعر فضاابن فیضی نے یہ کتاب آپ ہی سے پڑھی جیسا کہ فضا صاحب نے خاکسار کو بتایا اور مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری رحمہ اللہ نے گلستاں بوستاں وغیرہ، اور جناب عبدالحئی صاحب پسر عزیز مولانا عبدالعلی (متوفی ۱۹۶۷ء) نے اپنے والد کے حوالہ سے راقم کو بتایا کہ ان کے والد صاحب رحمہ اللہ نے ابتدائی عربی جماعتوں کی کتابیں آپ ہی سے پڑھیں، اور میرے ایک قریبی اور معمر ہمسایہ جناب الحاج محمد الیاس بن ادریس نے اپنے لڑکپن کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مولانا ابوالقاسم قدسی (متوفی

۴/جولائی ۱۹۵۴ء) برابر آپ کے گھر آیا کرتے تھے، اور آپ لوگوں کے مابین علمی مباحثے اور تبادلۂ خیالات ہوا کرتے تھے۔ مفتی صاحب ؒ نے بستر مرگ پر متعدد علماء مرحومین کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حافظ احمد اللہ صاحب عالم بھی تھے''۔ جیسا کہ دم تحریر مفتی صاحب کے فرزند اور بعض شاگردوں نے خاکسار کو بتایا۔

حصول علم کے بعد آپ نے اپنی پوری صلاحیت درس وتدریس، تعلیم وتربیت، امامت وخطابت اور دعوت وارشاد میں صرف کی، لکھنے اور تصنیف وتالیف کا مجھ کو علم نہ ہوسکا، البتہ مقدم الذکر امور میں اشتیاق وانہماک اتنا بڑھا کہ اپنی اہلیہ کی طویل علالت اور گھر کے نامساعد حالات کے باوجود بائیس سال تک وطن سے باہر زندگی گزاری، آپ نے دانا پور پٹنہ میں تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا، مدرسہ اصلاح المسلمین کی بھی خدمت کی، اور ایک عرصۂ دراز تک اپنے قصبہ اور اس کے مضافات میں اپنے فرائض علمی ادا کرتے رہے، زندگی کے آخری دور میں بارہ سال تک مدرسہ عالیہ عربیہ مئو میں شعبۂ حفظ میں تعلیم وتربیت اور معلّمی کا شاندار معنوی ریکارڈ قائم کیا کہ آج بھی بہت سے پاکیزہ نفوس میں آپ کی بے پناہ عقیدت ومحبت جاگزیں ہے، آپ کو کتاب اللہ سے حددرجہ قلبی لگاؤ تھا اور تادم حیات اس کی تعلیم میں ہمہ تن مصروف رہے، آپ ان ہی نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کے اندر تشہیر اور نام ونمود کا شائبہ تک نہ تھا، تواضع وانکساری بدرجۂ اتم موجود تھی، غالبا یہی وجہ تھی کہ اپنی عربی کی صلاحیت اور لوگوں کی فرمائش کے باوجود آپ عربی جماعتوں کی کتابیں پڑھانے سے گریز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: ''مجھے تو لوگ شروع ہی سے حافظ جانتے ہیں اور عربی پڑھانے والے لوگ موجود ہیں اور میرے پاس سند بھی نہیں ہے''۔

آپ صرف ایک کامیاب مدرس ہی نہیں تھے بلکہ ایک مثالی مربی بھی تھے، تلامذہ کے اخلاق وکردار کو سنوارنے میں آپ بے نظیر تھے، پڑھانے کے معاملے میں بہت سخت گیر تھے، لیکن ظالم نہیں تھے، نہایت وجیہ اور پرجلال شخصیت کے مالک تھے، بڑے حق گو اور بے باک، بقول مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی صاحب: ''آپ کا کافی دبدبہ تھا، طلبہ اور اساتذہ سبھی آپ کے قدرداں تھے، آپ جس راہ سے بھی گزرتے، لڑکے وہاں گولیاں کھیلتے سہم جاتے تھے''، اور بعض لوگ آپ کے جلال اور دبدبہ کا یہ عالم بتاتے ہیں کہ مدرسہ میں آپ کا قدم پڑتے ہی ہر چہار سو وقار وسکینت کا ماحول طاری ہوجاتا، راقم یہ سب کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہے، کیونکہ اس نے تو آپ کا زمانہ ہی نہیں پایا، بلکہ بعض ان لوگوں سے سنا ہے جنہوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے یا آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

آپ کی تعلیم وتربیت کا دائرہ مدرسہ تک محدود نہ تھا، محلے کے گلی کوچے، بازار، ساحل دریا وغیرہ خواہ کہیں بھی ہو، کسی کو کیا مجال تھی کہ ان کی دور بیں نگاہوں سے بچ کر اپنے غلط موقف سے نکل جائے، مناسب موقع محل میں آپ ضرور اس کی اصلاح وتربیت کرتے، پڑھنے پڑھانے یا کسی بھی مفید اور بامقصد کام کی انجام دہی کے وقت دوسری طرف ادھر ادھر متوجہ ہونے یا غفلت برتنے پر ایک طرف ایسا تھپڑ رسید کرتے کہ دوسری طرف گرنے کی نوبت آجاتی اور فوراً ہی دوسرا تھپڑ بھی دوسری

طرف سے پس جسم کا توازن صحیح ہوجاتا، آپ بار بار زدوکوب نہ کرتے تھے بلکہ ایک ہی دفعہ کی ضرب اورتادیب ہوش میں آنے اور نصیحت کے لئے کافی ہوتی۔

آپ حکیم مولانا محمد علی ابوالمکارم مئوی (متوفی ۱۹۳۳ء) کے خاص رفقاء میں سے تھے، غالباً یہی وجہ تھی کہ مولانا نے آپ کو اپنا ایک قطعۂ ارض ہبہ کردیا تھا، اب یہ رفاہ عام کے لئے ہے اور صحن کساری کے نام سے مشہور ہے۔

آپ جامع مسجد اہل حدیث ڈومن پورہ پچھّم مئو اور جامع مسجد اہل حدیث اورنگ آباد پھاٹک مئو میں خطبہ دیا کرتے تھے، سامعین پر رقت طاری ہوجاتی، قریب ہوتا کہ لوگ خشیت الٰہی سے رو پڑیں، نیز آپ کبھی کبھار ڈومن پورہ حبہ کی مسجد اہل حدیث میں وعظ ونصیحت کیا کرتے تھے۔

۱۹۵۹ء میں اپنی پیرانہ سالی کی بناپر تدریسی خدمات سے سبکدوش ہوگئے، اور مدرسہ نے آپ کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔

آپ پر فالج کا حملہ ہوا تھا، ایک طویل عمر پائی، آپ کی عیادت کے وقت بقول بعض علماء کرام: ''اس وقت ہماری نظر میں آپ کی عمر کا کوئی بھی نہیں''، علی الخصوص مولانا عبدالحکیم فیضی (متوفی ۲۰۰۳ء)، مولانا مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری (متوفی ۲۰۰۵ء)، مولانا عبدالباقی صاحب (کھیدوپورہ) (متوفی ۲۰۰۸ء)، حکیم مولوی عبدالباقی صاحب عمری (متوفی ۲۰۰۷ء)، مولوی منظور حسن صاحب (متوفی ۱۹۸۸ء) والد فضا ابن فیضی، حکیم مولوی فضل الرحمٰن تکمیلی (متوفی ۲۰۰۶ء) اور ڈاکٹر عبدالرحیم سعید علیگ وغیرہ عیادت کے لئے آیا کرتے تھے، ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک علیل رہ کر اپریل ۱۹۶۱ء مطابق ۱۳۸۰ھ میں وفات پائی، آپ کی نماز جنازہ حضرت مولانا شمس الحق دربھنگوی سلفی (متوفی ۱۹۸۶ء) نے پڑھائی، عیدگاہ اہل حدیث ڈومن پورہ پچھّم (مئو) کے مغرب طرف آپ کا مدفن ہے۔

اولاد:

آپ کے چار بیٹے عبدالواسع، عبدالرافع (متوفی نومبر ۱۹۹۱ء)، ریاض احمد، اور مولوی حافظ احمد مجتبیٰ (متوفی ۱۹۶۸ء) تھے، عبدالواسع اور ریاض آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، نیز یہ کہ ریاض فضا صاحب کے رفقاء میں سے تھے، اور عبدالرافع راقم کے دادا تھے، اور احمد مجتبیٰ مدرسہ فیض عام مئو کے فارغ التحصیل تھے، نیز آپ مولانا مختار احمد ندوی ؒ اور مولانا محمد اعظمی صاحب کے ہم سبق تھے، ایک عرصہ تک صاحب فراش رہ کر جوانی میں انتقال کیا، آپ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، آپ سے گہری دوستی کی وجہ سے ندوی صاحب آپ کے گھر بکثرت آیا کرتے تھے۔

اور حافظ صاحب موصوف کی تین بیٹیاں بھی حسنی، فاطمہ، اور زہرہ تھیں۔ نیز قابل ذکر ہے کہ حافظ صاحب -رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ- اپنے اہل وعیال کی ہدایت اوران کی دینی تعلیم وتربیت کا بہت اہتمام کرتے تھے، حتی کہ جس وقت آپ بستر مرگ پر تھے اور

زندگی کے آخری لمحات تھے، دیوار گھڑی کی سوئیوں کے دیکھتے ہوئے آپ نے اپنی اولاد واحفاظ کو مسجد میں جانے کا حکم دیا۔

اور مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ آپ ہی کے فیض تربیت اور نیک دعاؤں کا اثر ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کے خاندان کے لئے علم وحکمت کی راہیں ہموار کردیں، آپ کی ذریت میں برکت عطا فرمائی، یہ روز بروز پنپ رہی ہے، ان کی بڑی کثرت ہے اوران کی استعداد اور صلاحیتیں مختلف ہیں، چنانچہ راقم الحروف کے والد ماجد جناب حکیم قاری عطاء الرحمٰن فیضی صاحب (متوفی ۲۵/اپریل ۲۰۰۷ء) اوراعمام کرام جناب حکیم وڈاکٹر محبّ الرحمٰن علیگ صاحب، جناب حکیم مولوی ضیاء الرحمٰن اثری صاحب، جناب حکیم مصباح الرحمٰن صاحب، جناب حکیم مولوی شبیع الرحمٰن فیضی صاحب، جناب امتیاز احمد صاحب، جناب اشتیاق احمد صاحب اور جناب شمشاد احمد اثری صاحب آپ کے پوتے ہیں، اور شفیق الرحمٰن فیضی، عزیز الرحمٰن فیضی، مستفیض الرحمٰن، حماد الرحمٰن فیضی، عباد الرحمٰن، بلیغ الرحمٰن، عبید الرحمٰن، احسن جمیل، ارشد فہیم (مکتبہ الفہیم مئو کے ذمہ داران)، حافظ صفی الرحمٰن الریاضی، مسعود الرحمٰن، محمود الرحمٰن، ولی الرحمٰن عالی، مسرور احمد فیضی، ڈاکٹر سعود علیگ، عبد الباسط فلاحی، شیخ عبد الوارث مدنی صاحب (استاذ علوم حدیث جامعہ اسلامیہ دریاباد)، حافظ توصیف الرحمٰن، یاسر ندیم، حارث صفوان، سرفراز احمد، جاوید اختر عالی، پرویز اختر، جمال اختر عالی، ایاز احمد عالی، حافظ شہنواز عمری، شہباز اختر، ابومعاذ، ابوفواز اور ابوعبّاد آپ کے پڑپوتے ہیں، نیز آپ کے بہت سے پڑپوتے بھی صاحب عیال ہیں اوران کی بعض اولاد عنفوان شباب میں ہے، اور الحمد للہ سبھی حصول علم کے لئے کوشاں ہیں، ذلك من فضل الله علينا۔

تلامذہ:

مئو اور بیرون مئو کے اہل علم کی ایک بڑی تعداد آپ سے مستفید ہوئی، ان میں سے بعض کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

مولانا عبد الحکیم فیضی صاحب (متوفی ۲۰۰۳ء)، مولانا محمد اعظمی صاحب و جناب عبد الحئی صاحب پسران مولانا عبد العلی ؒ، الحاج مولانا عبد الاحد صاحب ناظم عالیہ (متوفی ۱۹۸۱ء)، حافظ عبد الغفار بن حافظ عبد السلام صاحب کساری (متوفی ۹/فروری ۱۹۸۱ء)، مولوی عبد الولی بن مولانا محمد علی ابوالمکارم مئوی صاحب (متوفی ۱۹۵۳ء)، حافظ اکبر علی بن عبد الحمید صاحب (متوفی ۱۹۵۱ء) برادر بزرگ ڈاکٹر عبد العلی ازہری، حافظ مختار احمد بن احمد صاحب حبہ، حافظ محمد یونس صاحب برادر مولانا عبد الحکیم مجاز اعظمی، مولانا حافظ محمد اسماعیل مدنی صاحب (متوفی ۲۰۰۳ء)، مولانا حافظ نثار احمد فیضی صاحب، حافظ بشیر احمد عالی (متوفی ۲۰۰۳ء) حافظ جلال الدین بن عبد الولی صاحب، حافظ صفات بن صفی اللہ صاحب کساری، منشی ذکاء اللہ صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی جامعہ عالیہ (متوفی نومبر ۲۰۰۶ء)، الحاج منشی یوسف بن عبد الحئی کساری، الحاج حافظ عبد الحئی بن حافظ عبد السلام صاحب کساری، مولوی عبد العزیز عالی صاحب ناظم مدرسہ محمدیہ سلفیہ دیوریا (متوفی ۲۰۰۳ء)۔

☆☆☆

حمد وثنا

نظیر راہیؔ

جس پر ترا کرم ہے وہی باکمال ہے
گر ہو نہ تیرا فیض تو جینا محال ہے

مالک ہے تو ہی تو ہی غفور و رحیم ہے
یا رب تیرے ہی ہاتھ عروج وزوال ہے

رازق ہے تو ہی سارے زمانے کا اے خدا
جو مانتا نہیں ہے وہی تنگ حال ہے

جو تیری بندگی سے گریزاں ہے اے خدا
ڈوبا ہے درد میں وہی غم سے نڈھال ہے

سورج میں ماہتاب میں پھولوں میں اے خدا
تیری تجلیوں سے ہی حسن وجمال ہے

راہیؔ کو مغفرت کی امیدیں تجھی سے ہیں
یارب تیرے حضور میں ادنی سوال ہے

کیا ہوگا

سالک بستویؔ

مسیحا کے لئے سولی سجا دینے سے کیا ہوگا
نہ بھولے جس کو رب اس کو بھلا دینے سے کیا ہوگا

نہ ڈوبا ہے نہ ڈوبے گا کبھی توحید کا سورج
فراز کفر کو اونچا اٹھا دینے سے کیا ہوگا

تمرّد کی دہکتی آگ جنت کا مزہ دے گی
ستم اللہ کے بندوں پہ ڈھا دینے سے کیا ہوگا

خدا ناراض ہو تو ناخدا آنسو بہائے گا
حسیں پتوار کشتی پر سجا دینے سے کیا ہوگا

اسے زرگر سمجھتے ہیں جو پیتل ہے وہ پیتل ہے
ملمع اس پہ سونے کا چڑھا دینے سے کیا ہوگا

مقرر ہے جو لمحہ موت کا وہ ٹل نہیں سکتا
سکوں آور دواؤں کو کھلا دینے سے کیا ہوگا

تبسم ریز اے سالکؔ نہ ہو فکر حسیں جس میں
وہ نغمہ بزم رنگیں میں سنا دینے سے کیا ہوگا

☆☆☆

اخبار جامعہ

ملتقی تکریم الطلاب المتفوقین

جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس میں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت اوران کی خفتہ صلاحیتوں کواجاگر کرنے کے لئے مختلف وسائل اختیار کئے جاتے رہے ہیں، ان میں مزید ایک وسیلہ کا اضافہ کرتے ہوئے گذشتہ دوسالوں سے ذہین طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے "ملتقی تکریم الطلاب المتفوقین " کےعنوان سےایک سالانہ پروگرام شروع کیا گیاہے، جس کے تحت ہر جماعت کے منتخب طلبہ کے مابین تحریری وتقریری مقابلہ کرایا جاتا ہے، یہ مقابلہ عربی واردو دونوں زبانوں پر مشتمل ہوتاہے، اوراس میں شامل ہونے والے تمام طلبہ کوتشجیعی انعام اور پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کوخصوصی انعام سےنوازا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ پروگرام انجمن ندوۃ الطلبہ کی جانب سے منعقد ہونے والے سالانہ تقریری وتحریری مقابلوں کے علاوہ ہوتاہے، اوراس میں خاص طور سے جامعہ کے منتخب طلبہ کوشریک کیا جاتا ہے۔

سال رواں میں اس نوعیت کا تیسراپروگرام بتاریخ ۲۷ رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۱ رجولائی ۲۰۰۸ءمنعقد ہوگا، ان شاءاللہ۔ اس سال کے پروگرام کا موضوع یہ مقرر ہوا ہے: **"علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ: حیات وخدمات"**، عالمیت اور فضیلت کے طلبہ کے لئے اس کے ذیلی عناوین اس طرح منتخب کئے گئے ہیں:

عربی

۱- **الشیخ عبد العزیز بن باز وعنایته بمسیرة الدعوة فی العالم** برائے فضیلت سال اول، دوم وسوم

۲- **الشیخ عبد العزیز بن باز فی ضوء مؤلفاته** برائے عالمیت سال اول ودوم

اردو

۳- **شیخ عبدالعزیز بن باز اور سلفی دعوت** برائے فضیلت سال اول، دوم وسوم

۴- **شیخ عبدالعزیز بن باز اور خدمت خلق** برائے عالمیت سال اول ودوم

☆☆☆

جامعہ سلفیہ بنارس میں وارانسی آئی بینک کے وفد کی آمد

بتاریخ ۸/مئی ۲۰۰۸ء بروز جمعرات بوقت ۱۱/ بجے صبح جامعہ سلفیہ بنارس میں وارانسی آئی بینک کی جانب سے ایک کیمپ لگایا گیا جس میں مذکورہ بینک سے وابستہ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے جامعہ کے طلبہ کے دانتوں اور آنکھوں کی جانچ کی اور انہیں مفید مشورے اور ہدایتیں دیں، اس موقع پر آئی بینک کے ذمہ دار ڈاکٹر نے جامعہ کے لکچر ہال میں طلبہ واساتذہ کو خطاب بھی کیا، اور آنکھوں اور دانتوں کی بیماریوں کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی اور مفید مشورے دیئے۔

محترم ناظم اعلی جامعہ سلفیہ مولانا عبداللہ سعود صاحب سلفی نے ڈاکٹر صاحب اوران کے رفقاء اوران کی تنظیم کا شکریہ ادا کیا اور مستقبل میں مزید اس قسم کے پروگراموں کے انعقاد کی درخواست کی، ظہر کی اذان کے ساتھ یہ پروگرام اختتام کو پہنچا۔

وفات

انتہائی رنج وغم کے ساتھ یہ اطلاع دی جارہی ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے شعبۂ حسابات سے منسلک محترم جناب ماسٹر عبدالمنان صاحب دارانگر بنارس ۷/مئی ۲۰۰۸ء بروز بدھ شام چھ بجے مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه ووسع مدخله واجعل الجنة مثواه.

ماسٹر عبدالمنان صاحب ولد مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا تعلق بنارس کے شہرت یافتہ عالم دین مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ کے خاندان سے تھا۔

مرحوم خوش اخلاق، نیک طینت وسیرت، صوم وصلاۃ کے پابند، معاملات میں صادق، خواص وعوام میں معزز ومحترم تھے، اور تقریبا چالیس سال تک جامعہ سلفیہ کی خدمت میں لگے رہے۔

انتقال کے وقت مرحوم کی عمر اٹھہتر (۷۸) سال سے زائد تھی، آپ کی تدفین وتکفین دوسرے روز ۸/مئی بروز جمعرات عمل میں آئی، جنازہ میں جامعہ سلفیہ کے منتظمین کے ساتھ ساتھ اساتذہ واراکین وغیرہم شریک رہے۔

ادارہ محدث مرحوم کے اہل خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں ان کا ٹھکانہ بنائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے، آمین۔

قارئین محدث اور افراد جماعت سے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☆☆☆

باب الفتاوی

س: (۱) اگر کئی جنازہ اکٹھا ہوجائیں تو ان تمام لوگوں کی اکٹھا نماز جنازہ پڑھنا درست ہے؟

ج: (۱) اگر کئی جنازہ اکھٹے ہوجائیں تو ان تمام کی ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھنا درست ہے، اگر ان مردوں میں بعض مرد اور بعض عورت ہوں تو بھی ایک ساتھ نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، لیکن ایسی صورت میں مردوں کے جنازوں کو امام کی جانب اور عورتوں کے جنازوں کو قبلہ کی جانب رکھنا بہتر ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "أنه صلى على تسع جنائز جميعا فجعل الرجال يلون الامام والنساء يلين القبلة" یعنی انہوں نے نو جنازوں کی اکٹھی نماز جنازہ پڑھی اور مردوں کو امام کے قریب اور عورتوں کو قبلے کے قریب کرلیا۔ (احکام الجنائز ص ۱۰۳، نسائی: ۱/۲۸۰، دار قطنی: ۱۹۴، بیہقی: ۴/۳۳) حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ (تلخیص الحبیر ۵/۲۷۶)

حارث بن نوفل کے آزاد کردہ غلام عمار سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابوسعید، حضرت ابوقتادہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے ایک مرتبہ نماز جنازہ کی ایسی ہی صورت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "هذه السنة" یعنی یہ سنت طریقہ ہے۔ (احکام الجنائز: ۱۰۳، ابوداود: ۳۱۹۳، کتاب الجنائز، باب اذا حضرت جنائز رجال ونساء من يقدم، بیہقی: ۴/۳۳، نسائی ۱/۲۸۰)

لیکن زیادہ جنازہ اکٹھا ہونے کی صورت میں بھی الگ الگ نماز جنازہ پڑھنا بہتر ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، حضرت محمد ﷺ نے شہدائے احد کے جنازہ میں ایسا ہی کیا ہے، جیسا کہ ان دونوں احادیث صحیحہ (۱) عن عبدالله بن زبير، قال: إن رسول الله ﷺ أمر يوم أحد بحمزة فسجي ببردة، ثم صلى عليه فكبر تسع تكبيرات، ثم أتى بالقتلى يصفون، ويصلى عليهم، وعليه معهم۔ (اخرجہ الطحاوی فی معانی الآثار: ۱/۲۹۰، اسنادہ حسن، رجالہ کلھم ثقات معروفون) (۲) عن ابن عباس قال: لما وقف رسول الله ﷺ على حمزة أمر به فهيء إلى القبلة، ثم كبر عليه تسعا، ثم جمع اليه الشهداء، كلما أتى بشهيد وضع الى حمزة، فصلى عليه، وعلى الشهداء معه حتى صلى عليه وعلى الشهداء اثنين وسبعين صلاة"۔ (اخرجہ الطبرانی فی معجمہ الکبیر: ۳/۱۰۷، ۱۰۸)

س: (۲) ایک قبر میں ایک سے زیادہ میت کو دفن کیا جا سکتا ہے؟

ج: (۲) حسب ضرورت ایک قبر میں اور ایک کفن میں ایک سے زیادہ افراد کو بھی دفن کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے: "عن جابر بن عبد الله قال: كان النبى ﷺ يجمع بين الرجلين (والثلاثة) من قتلى أحد فى ثوب واحد، ثم يقول: أيهم أكثر أخذا للقرآن؟ فإذا أشير الى أحدهما قدمه فى اللحد (قبل صاحبه) وقال: أنا شهيد على هؤلاء يوم القيامة، وأمر بدفنهم فى دمائهم، ولم يغسلوا ولم يصل عليهم۔ (قال جابر: فدفن أبى وعمى يومئذ فى قبر واحد)۔ (اخرجہ البخاری: ۱۶۳/۳، ۱۶۵، ۱۶۹، ۳۰۰/۷، والنسائی ۲۷۷/۱، والترمذی ۱۴۷/۲، بیہقی: ۱۴/۴)

اسی طرح کی بات حضرت عمرو بن جموع سے مروی روایت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ (اخرجہ أحمد: ۲۹۹/۵، بسند حسن کما قال الحافظ ۱۶۸/۳)

یہی بات حضرت ہشام بن عامر سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: "لما كان يوم أحد .... الى .... فقلنا: يا رسول الله ! الحفر علينا لكل انسان شديد، (فكيف تأمرنا) فقال: احفروا، وأوسعوا (وأعمقوا) (وأحسنوا) وادفنوا الاثنين والثلاثة فى القبر ...... الخ۔ (اخرجہ ابوداود ۷۰/۲، والنسائی ۲۸۳/۱-۲۸۴، الترمذی ۳۶/۳)

اس مسئلہ کی مزید تفصیل علامہ البانی ؒ کی تصنیف ''احکام الجنائز'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

س (۳) مسلمانوں کے وہ بچے جو اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ پیدا ہوتے ہیں ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ بعض جگہوں پر ایسے بچوں کو بغیر نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں تو کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

ج (۳) صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ استقرار حمل کے بعد چار مہینہ کے اندر اندر جو بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے سقط ہو جائے اس پر نماز جنازہ نہیں ہے (کیونکہ ایسی صورت میں وہ ایک انسان کے حکم سے خارج ہوتا ہے) اس پر علماء اسلام کا اتفاق ہے، لیکن استقرار حمل کے چار مہینہ کے بعد جب جنین میں روح پھونکی جا چکی ہو یعنی بچہ میں جان آ گئی ہو اس کے بعد جو بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے مردہ پیدا ہوا ہو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، کیونکہ آپ نے خود اس طرح کی میت پر نماز جنازہ پڑھی ہے، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس انصاریوں کا ایک (فوت شدہ) بچہ لایا گیا، فصلى عليه، آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ (صحیح سنن نسائی، باب الصلاۃ علی الصبیان، احمد ۲۰۸/۶)

اور اس طرح کی میت پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں آپ کا ارشاد گرامی صحیح حدیث میں موجود ہے کہ جو بچہ مردہ

پیدا ہوا ہو اس پر جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی اور اس کے والدین کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعاء کی جائے گی، عن مغيرة بن شعبة قال: قال رسول الله ﷺ: الراكب يسير خلف الجنازة والماشي يمشي خلفها وامامها وعن يمينها ويسارها قريبا منها والسقط يصلى عليه ويدعى لوالديه بالمغفرة والرحمة۔ (صحیح ابوداود:۲۷۲۳، کتاب الجنائز: باب المشی امام الجنازۃ، ترمذی:۱۰۳۱، نسائی ۵۶/۴، ابن ماجہ:۱۵۰۷)

صورت مسئولہ میں واضح ہوگیا کہ جو بچہ استقرار حمل کے چار ماہ کے بعد ماں کے پیٹ سے مردہ حالت میں پیدا ہوا ہو یا پیدا ہونے کے بعد مر گیا ہو، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، کیونکہ بچہ جب اپنی ماں کے پیٹ میں چار ماہ کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس میں روح پھونکی جاتی ہے اور اس کی مدت حیاۃ اور اس کا رزق اور شقی یا سعید ہونا لکھا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی صحیح بخاری وصحیح مسلم کی اس روایت میں ہمارے رسول ﷺ نے واضح طور پر فرمایا کہ "عن عبد الله بن مسعود، حدثنا رسول الله ﷺ وهو الصادق المصدوق: ان أحدكم يجمع فی بطن أمه أربعين يوما ...... الى ...... ثم يبعث الله ملكا فيومر بأربع كلمات، ويقال له اكتب عمله ورزقه وأجله وشقى أو سعيد، ثم ينفخ فيه الروح ...... الخ"۔ (صحیح البخاری:۳۲۰۸، ۳۳۳۲، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ، صحیح مسلم:۲۶۷۲۳، ابوداود:۴۷۰۸، ترمذی:۲۱۳۷، ابن ماجہ:۷۶، احمد:۳۸۲/۱، مسند ابویعلی:۵۱۵۷)

اور جس روایت میں یہ ہے "اذا استهل السقط صلى عليه وورث" کہ جب ناتمام بچہ پیدا ہونے کے بعد چیخ پڑے تبھی اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور اس کو وارث بنایا جائے گا، وہ روایت ضعیف ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل کتابوں میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ (احکام الجنائز ص ۱۰۶، نصب الرایۃ: ۲۷۷/۲، تلخیص الحبیر ۱۴۶/۵، المجموع:۲۵۵/۵)

الجواب صحیح
محمد رئیس ندوی
جامعہ سلفیہ بنارس

ہٰذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم
حررہ: ابوعفان نور الہدیٰ عین الحق سلفی مالدہی
جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس

☆☆☆